مولانا عبدالقدوس رومی*

حضرت الامام الشیخ محمد قاسم النانوتوی الصدیقی قدس سرہ کا سلوک واحسان

واقعات وحالات کے آئینہ میں

ملا ہے دفتر تنظیم سے عجب عنوان سلوک حضرتِ قاسم لکھوں عیاں کردں احساں

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا فرمان صادر ہوا کہ مجھے حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سے متعلق مجوزہ تذکار قاسمی (سیمینار) کے لئے حضرت امام موصوف کے ''سلوک واحسان'' پر ایک مقالہ تیار کرنا ہے۔

فرمائش پڑھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی، بار بار سوچتا رہا کہ ہمارے ان کرم فرماؤں کو احقر سے متعلق یہ خوش فہمی کیسے ہوگئی کہ وہ یہ فرمائش ایک ایسے شخص سے کر بیٹھے جسے کوچہ ''سلوک واحسان'' اور راہ اخلاص وعرفان کی ہوا بھی تو نہیں لگی ہے، اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جو آوارہ گردی سے محفوظ رہ سکا تھا وہ ''دیوبند سے بریلی'' تک کی سیاحی میں گزرا پھر کچھ ''تفہیم القرآن'' سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہوا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اب سے تقریباً نصف صدی قبل جب مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب غریق بحر رحمت نے اپنے وطن عزیز فتح پور تال نرجا (اعظم گڑھ) سے ہجرت نہیں فرمائی تھی اسی دور میں حضرت موصوف کی تعلیمات کی اشاعت کے لئے ایک ماہانہ رسالہ ''الاحسان'' نامی الہ آباد سے جاری کیا گیا تھا جس کی ادارت واشاعت کی ذمہ داری احقر کے سر تھی۔

ممکن ہے کہ ہمارے احباب تنظیم کو اسی رسالہ ''الاحسان'' کی نسبت سے کچھ غلط فہمی ہوگئی ہو، اس پرانی سرگذشت کو یہاں دہرانے سے مقصد صرف یہی اظہار حقیقت ہے کہ ذمہ داران تنظیم نے راقم آثم کے لئے جو عنوان تجویز فرمایا ہے اس کا پورا حق ادا کرنا تو بہت دور کی بات ہے اس کا تھوڑا حق

---

* مفتی شہر آگرہ (یوپی)

بھی ادا کر دینا احقر کے بس کی بات نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے کہ حضرت امام موصوف کی بلند و بالا شخصیت اس درجہ عظیم و عالی مقام تھی کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمہ مہتمم دارالعلوم دیوبند سوانح قاسمی کے مقدمہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی مختصر سوانح قاسمی کا تذکرہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''اس مختصر سوانح کا تذکرہ جب حضرت قطب وقت آیہ من ایات اللہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ مولانا محمد قاسم کی سوانح مولانا محمد یعقوب کیا لکھ سکتے ہیں؟ دنیا میں اگر ان کی حقیقی سوانح حیات کوئی لکھ سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں، مگر میں کیا کروں آنکھوں سے معذور ہوں''(۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے مرتبہ شناس حقیقی حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اس صریح وصاف اور واضح اعلان حقیقت کے بعد کس کی ہمت یہ جرأت و جسارت کر سکتی ہے کہ وہ حضرت امام موصوف کی ''سوانح'' نگاری کا ارادہ بھی کرے؟ راقم السطور ایسی جرأت و جسارت اپنے اندر تو پاتا نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ اندیشہ وخطرہ بھی دامن گیر ہے کہ اگر حضرات اصحاب تنظیم کے اس ارشاد گرامی کی عدم تعمیل کو بھی احقر کی ناروا ''جسارت'' پر محمول کر لیا گیا تو کیا ہوگا؟ **این المفر من هذا الخطر؟**

ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و درگذر کا طالب اور توفیق خیر رفیق کا خواہاں ہوتے ہوئے یوں دعا کی جائے کہ وہ اپنے فضل خاص سے زیردست وقلم اور بساط وطاقت سے باہر اس مضمون کی تکمیل آسان فرمادے اور اسے ملت مسلمہ کے لئے ذریعۂ اصلاح اور خود احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت اور وسیلۂ مغفرت بنائے۔ آمین

اس ضروری ومختصر اعتذار آمیز تمہید کے بعد ''مقالۂ مجوزہ'' پیش خدمت کیا جارہا ہے مگر اس سے پہلے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ''یک نظری''، ''چند سطری'' سوانح بھی اگر اسی موقع پر دوسری بیش قیمت تحریرات کے ساتھ قلم بند ومحفوظ ہو جائیں تو یقیناً ہر لحاظ سے ''برمحل'' ہی قرار پائے گی۔

یہ چند سطری، یک نظری ''سوانح'' احقر راقم السطور کو دیوبند سے شائع ہونے والی ایک

---

(۱) مقدمہ سوانح قاسمی: مولانا گیلانی ص:۹ ج ا۔

کتاب ''مکتوبات اکابر دیوبند'' میں دستیاب ہوئی ہے، اس کتاب کا مقدمہ حضرت مولانا مفتی نسیم احمد امروہوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے اور یہ سوانح اپنے اسی مقدمہ میں درج ذیل تمہید کے ساتھ نقل فرمائی ہے (یہ سوانح حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بچپن کے ساتھی اور پھر آپ کے مسترشد حضرت شیخ ضیاء الحق عثمانی دیوبندی کی تحریر کردہ ہے جو انہوں نے اپنی ڈائری میں نوٹ فرما رکھی تھی۔ احقر رومی) مفتی امروہوی صاحب فرماتے ہیں:

مولانا ضیاء الحق عثمانی کی ایک ''بیاض'' سے حضرت مولانا نانوتوی کی مجمل ومختصر سوانح عمری پیش کرتا ہوں، واقعی کوزے میں دریا کو بند کیا گیا ہے۔ (وہ سوانح عمری ملاحظہ ہو)

مولانا محمد قاسم صاحب ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے، ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں بمقام دیوبند وفات پائی۔

آپ کی عمر پچاس سال چار ماہ چار یوم ہوئی۔ اور ایک روایت سے پونے اڑتالیس برس کی ہوئی (ناقل سطور احقر رومی عرض کرتا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی عمر میں اختلاف کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں، ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت بقید تاریخ وماہ محفوظ نہ رہ سکی تھی جیسا کہ مختصر سوانح قاسمی یعقوبی سے ظاہر ہوتا ہے، آپ کے تاریخی نام ''خورشید حسین'' کی وجہ سے صرف سن ولادت ہی محفوظ رہا اور دوسری وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مجموعی عمر کی مدت ''انچاس سال چار ماہ چار یوم'' سن ہجری کے لحاظ سے متعین کی گئی ہے اور پونے اڑتالیس برس کی مدت سن عیسوی کے حساب سے بتائی گئی ہو۔

اور یہ عمر اس تفصیل سے بسر ہوئی (۱) نو سال والدین کے ناز ونعمت میں (۲) آٹھ سال تعلیم وتربیت میں (۳) آٹھ سال آزادی (تجرد) اور ذکر وشغل میں (۴) چوبیس سال ترقی اسلام ورفاہ مسلمین میں (یہ لطیفہ بھی خوب ہے کہ حضرات اہل حق اہل سنت وجماعت کو زبردستی ''وہابی'' کا نام دیگران کے لئے جو تاریخی عدد چوبیس تجویز کیا گیا ہے قدرت کی نظر میں حضرت امام قدس سرہ کی یہی چوبیس سالہ خدمات دین واسلام ہندوستان میں اسلام کی ''نشأۃ ثانیہ'' کی بنیاد قرار پاگئیں۔ (رومی)

دنیا میں حضرت مولانا کا مشہور نام محمد قاسم، تاریخی نام ''خورشید حسین'' (۱۲۴۸ھ) تخلص

قاسم کنیت ''ابوالمساکین'' اور عالم ارواح میں شمس الاسلام ــــ اور مولانا مرحوم کے (ان ناموں سے) نامزد ہونے کی تفصیل اس طرح پر ہے:

عرفی (مشہور) نام (محمد قاسم) تو آپ کے باپ دادا سے ملا، تاریخی نام (خورشید حسین) اور تخلص (قاسم) بہ نفس نفیس تجویز فرمایا اور کنیت ''ابوالمساکین'' پیرومرشد حضرت حاجی امداداللہ صاحب چشتی کے حضور سے عطا ہوا اور شمس الاسلام سرکار ''احکم الحاکمین'' سے عنایت ہوا (سرکار احکم الحاکمین کی طرف سے ''شمس الاسلام'' کا لقب عالم ارواح میں دیے جانے کی کوئی تفصیل تو خود مرتب سوانح مولانا ضیاء الحق عثمانی نے ذکر کی، نہ ہی ناقل سوانح حضرت مفتی نسیم احمد امروہوی نے کوئی ضرورت سمجھی حالانکہ اس کی ضرورت بہر حال تھی۔ احقر رومی)

مورخہ ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء یوم پنجشنبہ بوقت ایک بجے دن کے قبل الظہر ضیق النفس (دمہ) کی بیماری سے انتقال فرمایا (اناللہ وانا الیہ راجعون)

حضرت مولانا ضیاء الحق عثمانی علیہ الرحمہ کی اس یک نظری و چند سطری سوانح تو اوپر ملاحظہ میں آچکی اب انہیں بزرگوار کی مفصل سوانح قاسمی کے مسودہ کا حسرتناک وعبرتناک حشر بھی حضرت موصوف مفتی نسیم احمد امروہوی کی زبانی سن لیجئے، موصوف ؒ نے اس مفصل سوانح کا تذکرہ بھی اپنے اسی مقدمہ مذکور میں فرمایا ہے فرماتے ہیں:

> دفتری صاحب (یعنی نورالحق عثمانی جو مولانا ضیاء الحق عثمانی کے صاحبزادے تھے اور مولانا ضیاء الحق عثمانی حضرت حاجی رفیع الدین صاحب دیوبندی کے داماد تھے) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ ان کے والد ماجد مولانا ضیاء الحق عثمانی نے حضرت ''قاسم المعارف'' کی مفصل سوانح عمری لکھی تھی احقر نے اس کے مطالعہ کی انتہائی کوشش کی، دفتری صاحب ہی سے معلوم ہوا وہ ان کے کسی عزیز کے پاس ہے، گذشتہ سال (یعنی ۱۳۷۷ھ) انھوں نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ وہ سوانح عمری دارالعلوم دیوبند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار شخص نے لے کر تلف کردی۔ [۲] اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس المناک واقعہ کا نہ صرف عبرتناک بلکہ دردناک یہ پہلو خاص طور پر قابل غور ہے کہ آخر اس مفصل سوانح عمری میں ایسی کیا بات تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار شخص نے اسے تلف

---

(۲) مکتوبات اکابر دیوبند ص: ۱۵

کر دینا ہی ضروری سمجھا گیا در پردہ اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ اس سے چند ہی سال قبل یعنی ۱۳۷۳ھ میں حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی علیہ الرحمہ کی ''سوانح قاسمی'' دار العلوم دیوبند کی طرف سے شائع ہو چکی تھی جس کے مصنف حضرت مولانا گیلانی صاحب سوانح قدس سرہ کے نہ تو معاصر تھے نہ ہی مندرج واقعات و حالات کے چشم دید گواہ تھے اور اس کے برخلاف اس تلف شدہ سوانح کے مصنف حضرت امام نانوتوی کے معاصر، بچپن کے ساتھی ہونے کے ساتھ حضرت امام کے مسترشد و مکتوب الیہ بھی رہے تھے جن کے نام حضرت امام نانوتوی کے بعض مکاتیب ''مکتوبات اکابر دیوبند'' کے زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں۔

شبہ ہوتا ہے کہ اس مسودہ کے تلف کرنے میں ممکن ہے کچھ کاروباری جذبہ شامل ہو گیا ہو اور یہ خیال کر لیا گیا ہو کہ اس مسودہ کی اشاعت ہو جانے سے دار العلوم دیوبند سے شائع ہونے والی سوانح قاسمی (مولانا گیلانی) کی مقبولیت و اشاعت متاثر ہو سکتی ہے اس لئے اسے تلف کر دینا ہی بہتر ہے۔

حقیقت حال کا علم تو صرف عالم حقیقی ہی کو ہے محض ظن و تخمین سے کوئی متعین بات کہی بھی نہیں جا سکتی تاہم اس حقیقت کا اظہار تو شاید کسی طرح بھی ناروا اور بیجا نہ ہوگا کہ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن ایسے اہم مسودہ کا ضیاع ''تاریخ قاسمی'' سے متعلق ناقابل فراموش سانحہ ہے۔

سوانح قاسمی (مصنفہ حضرت مولانا گیلانی) کے مقدمہ میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم علیہ الرحمہ نے بھی اس مسودہ کے علاوہ بعض دوسرے چند مسودات سوانح قاسمی کا ذکر فرمایا ہے ان تفصیلات کو نظر میں رکھنے سے اندازہ یہی ہوتا ہے جسے کہا گیا ہے:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مرادِ متقیں

چنانچہ حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے مقدمہ میں متعدد سوانح کے مرتب ہونے اور اشاعت سے پہلے ہی تلف و ضائع ہونے کی بات کہہ کر یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ:

> ''متعدد بزرگ سوانح نگاری پر متوجہ ہوئے اور سوانح عمریاں کافی مواد کے ساتھ تفصیلی طور پر مرتب ہوئیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا صورت واقعات یہ ہے کہ ''سوانح عمریاں'' مرتب ہوتی رہیں اور کسی مخفی ہاتھ سے سامنے آنے سے پہلے ہی تلف بھی ہوتی رہیں۔ (۳)

---

(۳) مقدمہ سوانح قاسمی ص:۹

راقم السطور سے ''سلوک واحسان حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ پر مضمون کی فرمائش کی گئی ہے اس لئے احقر نے اپنے لئے سہولت اسی صورت میں سمجھی کہ حضرت موصوف سے متعلق موجود کتب سوانح کو بالاستیعاب ''سلوک واحسان'' کا چشمہ لگا کر دیکھا جائے۔

اسی جہت سے سطور بالا میں حضرت الامام قدس سرہ کی یک نظری و چند سطری سوانح بھی بطور یادگار و تبرک پیش نظر رکھ لی گئی ہے کہ راقم السطور اپنے موضوع سے متعلق معروضات وگذارشات میں حضرت امام قدس سرہ کی اس مختصر و قلیل مدت حیات کو نظر میں رکھتے ہوئے حضرت والا کے ''سلوک وعرفان'' کو زیر بحث لائے، کیونکہ عام مشاہدات وتجربات اس بات پر شاہد ہیں کہ عام طور پر کسی بزرگ شخصیت کا ''سلوک وعرفان'' ان کی ''کہولت ومشیخت'' ہی کی عمر میں جوان ہوتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام قدس سرہ اس دور کہولت ومشیخت تک پہنچنے سے پہلے ہی راہی جنت اور واصل بحق ہو گئے ہیں جس وقت کہ خود حضرت امام عالی مقام کے پیر ومرشد وشیخ طریقت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی بہ نفس نفیس بقید حیات مکہ معظمہ میں قیام فرماتے تھے، نیز حضرت امام موصوف کے استاذ حدیث حضرت شاہ عبد الغنی صاحب مجددی نقشبندی دہلوی مہاجر مدنی بھی مدینہ منورہ طاب ثراہا میں آپ کی وفات سے ایک سال پہلے تک (یعنی ۶ محرم ۱۲۹۶ھ تک) بقید حیات فیض رسان خلائق بنے ہوئے تھے۔

ان دو بڑے شیخ المشائخ کے علاوہ اور بھی متعدد شیوخ طریقت آپ کے معاصر موجود تھے اس لئے ہمارے حضرت امام قدس سرہ کے لئے پردۂ خمول وگمنامی میں رہتے ہوئے ''اخفائے حال'' آسان تھا جس سے آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا جیسا کہ اس سلسلہ کی بعض تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے جو آئندہ سطور میں شامل مضمون بھی کی جائیں گی، صرف نمونہ کے طور پر مولانا ضیاء الحق عثمانی کے نام دو خطوط یہاں نقل کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ پہنچا پہلا خط بھی دلی میں یاد پڑتا ہے آیا تھا پر بعض وجہ سے مقصر رہا، اب آپ اپنا جواب لیجئے جیسے لڑکے کھیلتے وقت کسی کو بادشاہ کسی کو وزیر بنا لیتے ہیں، ایسی ہی میری پیری سمجھئے، یہی وجہ تھی کہ تم سے ہنسی میں کہہ دیا کرتا تھا کہ ''شیخ بدو! تم مجھ سے مرید ہو جاؤ'' جب تم

واقعی مرید ہونے کو تیار ہوئے تو واقعی حال کہنا پڑا۔

ہاں وظیفہ کا کچھ مضایقہ نہیں، نماز پنجگانہ تو باجماعت پڑھتے ہی ہوگے، بعد ہر نماز کے ایک تسبیح اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم کی اور بعد عشا تین تسبیح يَا حَيُّ يَا قَيُّوم بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ کی پڑھ لیا کرو، عشا کی تسبیحوں کے اول و آخر گیارہ گیارہ بار درود بھی کہہ لیا کرنا اور سوا اس کے اگر جی چاہا کرے تو کلمہ اول اور درود شریف کی جتنی کثرت ہو سکے اتنی بہتر ہے مگر جو وظیفہ پڑھو اس کے پڑھتے وقت یہ سمجھا کرو کہ خدا کے سامنے حاضر ہوں اور زبان دل سے عرض کر رہا ہوں باقی خیریت ہے۔

تمہارے بھتیجے عین الحق و عزیز الحق یہیں ہیں اور تمہارے بڑے بھائی بھی کل سے آئے ہوئے ہیں سب بخیریت ہیں اور سب کو سلام کہتے ہیں چچا صاحب کی خدمت میں آداب عرض کرتے ہیں، اپنی چچی اور بھائی کو میرا بھی سلام کہہ دینا۔ رقیمہ محمد قاسم از نانوتہ صفر ۱۲۹۳ھ (۴)

تعلیق راقم برنامہٗ مذکور

حضرت الامام قدس سرہ کے جواب مذکور سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شیخ ضیاء الحق موصوف نے اپنے خط میں کیا بات لکھی تھی جس کا جواب دیا جا رہا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب موصوف نے بھی اپنے خط میں حضرت امام کو ''شیخ بدو! تم مجھ سے مرید ہو جاؤ'' والی پرانی بات کے حوالہ سے حضرت والا قدس سرہ سے بیعت ہونے کی درخواست کی ہوگی جس کا جواب حضرت قدس سرہ نے کیسے لطیف و پر مذاق انداز میں دیکر اور اس پرانی بات کو بچوں کا کھیل بتا کر ان کی درخواست بیعت کو یوں رفت و گذشت کر دیا جیسے وہ کوئی قابل ذکر بات ہی نہ تھی۔

درخواست بیعت کے ساتھ شیخ صاحب نے حضرت والا قدس سرہ سے کوئی ''وظیفہ'' بھی دریافت کیا ہوگا، اس درخواست کی پذیرائی ہوگئی اور موصوف کو صرف ایک وظیفہ نہیں بلکہ دو تین وظیفے بتا دیئے گئے۔

جواب سامی قاسمی کا نکتۂ خاص

راقم السطور کی نظر سے ایسے بہت سے خطوط گذرے ہیں جن میں سائل نے کسی بزرگ سے

(۴) مکتوبات اکابر دیوبند ص ۴۷۔

کوئی وظیفہ وعمل دریافت کیا ہے اور ان بزرگ نے دریافت کرنے والے کو جواب میں صرف وظیفہ یا عمل بتادیا ہے اور بس۔

لیکن اس مکتوب قاسمی کا نکتۂ خاص یہ ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ پوچھنے والے کو صرف وظیفہ ہی نہیں بتاتے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ غیر رسمی اور بالکل غیر محسوس طور پر سائل کو "مراقبۂ احسان" کی بھی تلقین فرمائے جارہے ہیں مگر بالکل ایسے طور پر کہ سائل کو یہ بالکل محسوس نہ ہونے پائے کہ اسے کیسے عجیب انداز میں مراقبہ احسان کی مشق بھی کرائی جارہی ہے:

(۲) عزیزم شیخ ضیاء الحق صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ کمترین محمد قاسم بعد سلام مسنون عرض پرداز ہے کہ عشرۂ اول محرم میں آپ کا عنایت نامہ میرے پاس رام پور پہنچا تھا، جواب کا فکر تو اسی روز سے تھا پر وہاں تو بوجہ کثرت آمد ورفت اہل ملاقات اتفاق نہ ہوا۔ وہاں سے آیا تو ایک ہی شب رہنے کا اتفاق ہوا تھا کہ ناگہاں بریلی کے آب ودانہ نے زور کیا تین چار روز ہوئے کہ بدقت تمام وہاں سے آنا ہوا بہت سے خط جمع ہوگئے تھے آج خطوط جواب طلب کے جواب میں دن گزرا آپ کا عنایت نامہ بھی نکالا اور جواب لکھنا شروع کیا۔

عزیز من! نہ میں اس قابل کہ خود کسی کی رہبری کروں، اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں؟ البتہ دو چار بزرگوں سے عقیدت ہے ایک تو جناب حاجی امداد اللہ صاحب دوسرے شاہ عبدالغنی صاحب ان کے بعد مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، ان بزرگوں میں سے جس کی صحبت میسر آجائے غنیمت جانو اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو، اس قسم کی تفتیش کا دستور اہل سلوک میں نہیں اگر یہ بات ہوتی تو پہلے سالک کو بھی ہوا کرتی، زیادہ بجز امید والتماس دعا اور کیا عرض کروں، اپنے چچا اور بھائی سے میرا سلام کہنا والسلام۔ ۶؍صفر ۱۲۹۶ھ از نانوتہ (۵)

تعلیق راقم السطور رومی بر نامۂ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کا یہ دوسرا مکتوب گرامی بھی ویسی ہی صاف ستھری روزمرہ کی زبان میں ہے کہ خود جوابِ خط کے الفاظ ہی سے یہ بات منکشف ہوجاتی ہے کہ شیخ ضیاء الحق صاحب

(۵) مکتوبات اکابر دیوبند ص ۵۵۔

نے اپنے خط میں حضرت امام قدس سرہ سے کیا بات دریافت کی تھی۔

نامہ گرامی کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جناب شیخ ضیاء الحق صاحب نے جب دیکھا کہ حضرت امام قدس سرہ نے پیری مریدی کی بات کو بچپن کا ایک کھیل بتا کر بات ٹال دی ہے تو انھوں نے بہت غور وخوض کر کے تقریباً ایک سال بعد یہ دوسرا خط لکھا تھا جس میں انھوں نے حضرت قدس سرہ سے یہ دریافت کیا ہوگا کہ اگر جناب خود مجھے بیعت نہیں فرما رہے ہیں تو پھر مجھے یہ مشورہ ہی دے دیجئے کہ میں کس سے بیعت کروں؟ اور اسی سلسلہ میں شاید انھوں نے یہ سوال بھی کر لیا ہوگا کہ سلوک وطریق میں میرا حصہ کس بزرگ کے ہاں ہے کہ میں اس سے بیعت ہو جاؤں۔

ان دونوں ہی سوالوں کا مختصر جواب حضرت امام قدس سرہ نے یہ دے دیا کہ:

عزیز من! نہ تو میں اس قابل ہوں کہ خود کسی کی رہبری کروں، اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں —— ان بزرگوں میں سے جس کی صحبت میسر آجائیں غنیمت جانو اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو، اس قسم کی تفتیش کا دستور اہل سلوک میں نہیں۔

مکتوب گرامی کے یہی آخری خط کشیدہ فقرے قابل غور ولائق توجہ ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بالکل غیر ارادی طور پر حضرت امام قدس سرہ کے قلم سے سلوک وعرفان کی ایک بہت بڑی حقیقت لکھوادی جس سے حضرت امام قدس سرہ کا کمالِ عرفان بھی ظاہر ہو گیا کہ اصل سلوک صرف سلوک ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے:

سلوک راہ بھی ہے اور سلوک منزل بھی   اسی سلوک سے مالک ہوئے ہیں واصل بھی
فراق ووصل چہ خواہی رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

حضرت امام قدس سرہ کے یہ دو مکتوب گرامی بطور نمونہ یہاں نقل ہو گئے، اس سلسلہ کے دوسرے مکتوبات انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ پیش خدمت ہوں گے۔

حالات زمانہ وابنائے زمانہ کو دیکھتے ہوئے طبیعت کا تقاضہ ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک وعرفان پر تفصیلی گفتگو سے پہلے نفس سلوک وتصوف کی اہمیت وضرورت واضح کر دی جائے جس کی وجہ یہ صورت حال ہے کہ دور حاضر کے مدعیان اسلام کے مختلف حلقوں اور طبقوں کی طرف سے مطلق "سلوک واحسان" اور طریق تصوف وطریقت کا شدت سے انکار کیا جا رہا ہے، اسے

نہ صرف یہ کہ خلاف کتاب وسنت کہا جارہا ہے بلکہ اس سے بھی اور آگے بڑھ کر اس کا رشتہ اہل شرک وبدعات کے مراسم اور اہل ہند کے سنیاس اور جوگ سے جوڑ کر خلاف دین ومذہب صریح ضلال وگمراہی ٹھہرایا جارہا ہے۔

ان حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم کسی مخصوص بزرگ شخصیت کے سلوک واحسان کی خصوصی بحث کرنے سے پہلے نفس سلوک واحسان ہی کی ضرورت واہمیت اور اس کے مرتبہ ومقام پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ حقیقت واشگاف کردیں کہ کتاب وسنت اور دین وشریعت کی روشنی میں خود اصل سلوک وتصوف کا مقام کیا ہے؟

تصوف وسلوک کے خلاف جو لوگ سرگرم نظر آتے ہیں غور وفکر کے بعد کا تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو کتاب وسنت کی ان تعلیمات ہی سے بے خبر ہیں جن کی رو سے علم فقہ وشریعت کی طرح علم اخلاق وسلوک طریقت بھی فرض قرار پاتا ہے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے نام نہاد مدعیان تصوف کے خلافِ شرع مراسم طریقت وتصوف کو دیکھ کر سرے سے اصل سلوک وتصوف کو قابل انکار ٹھہرادیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصوف وطریقت بھی علم دین وشریعت ہی کا ایک اہم حصہ اور جزو لازم ہے۔

مشاہدہ گواہ ہے کہ ہر انسان بالخصوص ہر مسلمان اپنے وجود ظاہری میں دو چیزیں رکھتا ہے اس کا ایک وجود تو اس کے ظاہری جسم وبدن کا وجود ہے اور اس کا دوسرا وجود وہ ہے جسے ہم انسان کے باطن اور قلب وروح سے تعبیر کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح انسان کامل کے دو رخ ہیں ظاہر و باطن یا قلب وقالب اسی طرح دین کامل کے بھی دو رخ ہیں، شریعت وطریقت یا اعمال جوارح واعمال قلب، اعمال جوارح سے متعلق رخ کو شریعت اور اعمال قلب سے متعلق رخ کو تصوف وطریقت کہتے ہیں، طریقت شریعت کے لئے لازم ہے اس سے مغایر ومتضاد کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ نام نہاد مدعیان تصوف نے مشہور کر رکھا ہے۔

حضرت مصلح الامت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ " تصوف ونسبت

صوفیہ'' میں حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

من تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن جمع بينهما فقد تحقق.

یعنی جس شخص نے تصوف تو حاصل کیا لیکن فقہ سے نابلد رہا تو سمجھو کہ وہ زندیق و بے دین ہی رہا اور جس شخص نے شریعت و فقہ کو تو حاصل کیا لیکن تصوف نہیں حاصل کیا تو وہ خشک ملا ہی رہا اور جس نے فقہ اور تصوف دونوں کو جمع کیا اور دونوں چیزیں حاصل کیں تو وہ شخص صحیح معنی میں محقق ہو گیا۔

اسی شریعت و طریقت سے متعلق فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے فتاوی رشیدیہ سے دو سوالوں کے جوابات کا خلاصہ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

جواب اول مختصراً

اس سوال کو بے فائدہ اس قدر طویل لکھا خلاصۂ جواب یہ ہے کہ علم شریعت و علم طریقت ایک ہی ہے اور شریعت و طریقت بھی ایک ہی ہے جب آدمی کو حکم شریعت معلوم ہوا علم شریعت حاصل ہوا اور جب کنہ اس حکم کی معلوم ہوئی وہ علم طریقت ہوا اور عمل بقدر ادائے فرض و واجب کے بہ تکلف نفس سے کرانا عمل بہ شریعت کہلاتا ہے اور جب اخلاص و حب حق تعالیٰ تہ دل میں ساری ہو گئی اس کو عمل بہ طریقت کہتے ہیں۔

جب تک کشاکش علم و عمل کی ہے شریعت ہے جب طمانینت ہو گئی وہ طریقت ہے، ابتدا اور انتہا کا فرق ہے جس نے اصل شے کے واحد ہونے کو خیال کیا ایک کہا یہ بھی درست ہے اور جس نے اول و آخر کا تفرقہ کیا دو کہہ دیا یہ بھی صحیح ہے مطلب دونوں کا واحد ہے۔

جواب دوم مکمل

یہ دونوں ایک ہیں ظاہر سے عمل کرنا شرع ہے اور جب قلب میں حکم شرع کا داخل ہو کر طبعاً عمل شرع ہونے لگے وہ طریقت ہے۔ دونوں کا حکم قرآن و حدیث سے ہے ادنیٰ درجہ شرع ہے۔ اس کا ہی اعلیٰ درجہ طریقت کہلاتی ہے۔ (۶)

ان معروضات کی روشنی میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ تصوف

---

(۶) فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۱۶۔ ۲۱۷ درسی کتب خانہ دہلی۔

وطریقت بھی فی الحقیقۃ دین وشریعت اور فقہ احکام ہی کا ایک حصہ ہیں۔

اسی جہت کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے فقہ کی جو تعریف منقول ہے وہ فقہ ظاہری (شریعت) اور فقہ باطنی (طریقت) دونوں ہی کے لئے جامع سمجھی گئی ہے فرماتے ہیں:

علم الفقہ کی تعریف ہے: مَعْرِفَةُ النفسِ مَا لَهَا وَ مَاعَلَيهَا.

یعنی نفس انسانی ہر اس بات سے واقف وباخبر ہو کہ کون کون سے کام اس کے حق میں نافع ومفید ہیں اور کون کون سے کام اس کے حق میں غیر مفید اور ضرر رساں ہیں، اسی واقفیت وآگاہی کو فقہ کہتے ہیں۔

مناسب ہوگا کہ اسی موقع پر ایک نظر علم سلوک وتصوف کی تعریف پر بھی ڈال لی جائے کہ حضرات صوفیہ علم تصوف کی تعریف کیا کرتے ہیں مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ اپنے رسالہ تصوف ونسبت صوفیہ میں فرماتے ہیں:

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علمائے تصوف نے یہ فرمائی ہے هُوَ عِلْمٌ تعرف به أحوال تزكية النفوس وتصفية الاخلاق وتعمير الظاهر والباطن لنيل السعادة الابدية.

قابل غور اور لائق توجہ نکتہ خاص یہ ہے کہ فقہ وتصوف کی مذکورہ ہر دو تعریفوں کا حاصل ولب لباب ایک ہی ہے اگر کچھ فرق ہے تو وہ صرف مجمل ومفصل کا ہے حضرت امام اعظم سے فقہ کی جو تعریف نقل ہوئی ہے وہ اگرچہ بظاہر بہت مختصر ومجمل ہے لیکن یہ حضرت امام کا کمال بلاغت ہے کہ انہوں نے صرف ایک فقرہ میں وہی بات ادا کر دی جو تصوف کی تعریف پر مشتمل تین چار فقروں میں کہی گئی ہے حالانکہ اگر یہاں بھی اختصار کا ارادہ کیا جاتا تو یہ مفصل تعریف ایک ہی جملہ میں سمیٹی جاسکتی تھی اور کہا جاسکتا تھا کہ علم تصوف تعمیر ظاہر وباطن کا نام ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ طریقت اور اصلاح باطن کی ضرورت سے بحث کرتے ہوئے اپنی مشہور ومہتم بالشان تصنیف ''التکشف عن مہمات التصوف'' میں فرماتے ہیں:

اور کون نہیں جانتا کہ بے شمار آیات اور بے انتہا روایات اعمال باطنی اور اخلاق کی اصلاح کی

فرضیت پر دال ہیں، قرآن وحدیث میں زہد وقناعت، تواضع، اخلاص، صبر وشکر، حب الٰہی، رضا بالقدر، توکل وتسلیم وغیرذالک کی فضیلت اوران کی تحصیل کی تاکید اوران کے اضداد حب دنیا، حرص، تکبر، ریا، شہوت، غضب، حسد ونحوہا کی مذمت اوران پر وعید وارد ومذکور ہے۔

پھران کے مامور بہا اور منہی عنہا ہونے میں کیا شبہ رہا اور یہی معنی ہیں اصلاح اعمال باطنی کے، یہی عمل اصلی ہے طریقت میں جس کا فرض ہونا بلا اشتباہ ثابت ہے (۷)

زیر تحریر مضمون ومقالہ چونکہ حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ کے سلوک واحسان سے متعلق ہے، مناسب تو یہی تھا کہ اس بحث میں بھی حضرت امام موصوف کی کوئی تحریر تبرکاً شامل مضمون ہوجاتی لیکن اس قلیل البضاعت کو اس میں تو کامیابی نہ ہوسکی البتہ حضرت موصوف کے یار غار پوری عمر کے ساتھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی ایک خودنوشت تحریر تذکرۃ الرشید حصہ دوم میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے محفوظ فرمادی ہے استبراکاً وہ تحریر مبارک احقر راقم کی مطلب خیز ترجمانی کے ساتھ یہاں نقل کی جارہی ہے:

علم الصوفية، علم الدين ظاهراً وباطناً وقوة اليقين وهو العلم الاعلىٰ، حالهم اصلاح الاخلاق و دوام الافتقار الى الله تعالىٰ، حقيقة التصوف، التخلق باخلاق الله وسلب الارادة وكون العبد فى رِضاء الله تعالىٰ، اخلاق الصوفية، ما هو خلقه عليه السلام بقوله اِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عظيم وما ورد به الحديث.

وتفصيل اخلاقهم هٰكذا، التواضع ضده الكبر، المداراة واحتمال الاذى عن الخلق، المعاملة برفق وخلق حسن وترك غَضَبٍ وغيظ، المواساة والايثار بفرط الشفقة على الخلق وهو تقدم حقوق الخلق على حظوظه، السخاوة، التجاوز والعفو، طلاقة الوجه والبشرة، السهولة ولين الجانب ترك التعسف والتكلف، انفاق بلااقتار و ترك الادخار، التوكل، القناعة بيسر من الدنيا، الورع، ترك المراء والجدال والعتب الا بحق ترك الغل والحقد والحسد، ترك المال والجاه، وفاء الوعد، الحلم، الاناءة، التوادد، والتوافق مع الاخوان

(۷) التکشف بحوالہ تصوف ونسبت صوفیہ ص ۴۲، از حضرت مصلح الامت علیہ الرحمۃ۔

والعزلة عن الاغيار وشكر المنعم، بذل الجاه للمسلمين.

الصوفی یهذب الظاهر والباطن فی الاخلاق والتصوف ادب کله، ادب الحضرة الالهیة، الاعراض عما سواه حیاءً واجلالاً وهیبةً، اسوء المعاصی حدیث النفس وسبب الظلمة.(۸)

حضرات صوفیہ کا علم (یعنی علم تصوف کوئی نیا علم نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت) علم دین ہی ہے جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں ہی سے متعلق ہے اور یہ علم تصوف اس علم دین میں قوت یقین کا ذریعہ بنتا ہے اور درحقیقت یہی علم سب سے اعلیٰ ہے اور حضرات صوفیہ کا دائرہ عمل اصلاح اخلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی حاجت مندی کا دائمی اظہار ہے۔

تصوف کی اصل حقیقت اپنے ارادہ کا ترک وسلب ہے اور حق تعالیٰ کے اخلاق سے آراستگی ہے اور یہ کہ بندۂ خدا اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں لگا رہے اور صوفیہ کے یہ اخلاق وہی ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ تھے جسے اللہ تعالیٰ اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عظیم کے ذریعہ بیان فرمایا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے اور حضرات صوفیہ کے ان اخلاق کی فہرست ایک نظر میں یوں دیکھی جاسکتی ہے۔

ا۔ تواضع یعنی عاجزی جس کی ضد کبر و تکبر (اپنے کو بڑا سمجھنا) ہے (۲) مدارات (اخلاق و رواداری) (۳) مخلوق سے جو تکلیف پہنچے اسے برداشت کرنا (۴) حسن اخلاق اور نرمی سے معاملہ کرنا (۵) غصہ وغضب نہ کرنا (۶) دلجوئی اور دوسروں کا خیال اپنے سے زیادہ رکھنا یعنی عام لوگوں کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کرنا (۷) سخاوت کرنا (۸) عفو و درگذر سے کام لینا (۹) لوگوں کے ساتھ کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا (۱۰) لوگوں کے ساتھ آسانی و نرمی کا معاملہ کرنا (۱۱) تصنع بناوٹ اور تکلف سے دور رہنا (۱۲) خرچ میں اعتدال کہ تکلیف بھی اٹھائے اور آئندہ محتاجی بھی نہ ہو (۱۳) ذخیرہ اندوزی کا ترک کرنا (۱۴) اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا (۱۵) تھوڑی دنیا پر قناعت کرنا زیادہ کی ہوس نہ کرنا (۱۶) بحث ومباحثہ اور مقابلہ ومجادلہ سے دور رہنا مگر حق بات کے لئے بحث ومباحثہ کی اجازت ہے (۱۷) بغض، کینہ اور حسد سے دل کو خالی

(۸) تذکرۃ الرشید، ج ۲، ص ۱۱۔

رکھنا (۱۸) مال و جاہ کی محبت نہ رکھنا (۱۹) وعدہ پورا کرنا (۲۰) بردباری اختیار کرنا (۲۱) اطمینان وسکون سے کام کرنا (جلد بازی نہ کرنا) (۲۲) دوستی و موافقت کے ساتھ رہنا (۲۳) اہل اسلام کے لئے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرنا۔

مندرجہ فہرست اخلاق کو نظر میں رکھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ صوفی اپنے ظاہر و باطن کو درست کر کے اور اسے سنوار کے تہذیب اخلاق کرتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تصوف کل کا کل ادب ہے (طرق العشق کلها اداب، ادبوا النفس ایها الاصحاب) حضرت باری تعالیٰ کا ادب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے رہو اس کے جلال و ہیبت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ماسوا سے اعراض و بے توجہی رکھی جائے، اور سب سے بڑا گناہ کہ دل ہی دل میں گناہ کی باتیں کرتا ہے یہ حدیث نفس دل کی تاریکی کا سبب ہے اللهم احفظنا منه.

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر امام اہل الہند صاحب حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کی تفهیمات الٰهیه سے بھی کچھ اقتباس پیش کر دیں۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک بات اس طرح شروع فرمائی ہے۔

وَمُعْظَمُ مَا دَعَتْ اِلیٰ اِقامته الرسل امور ثلثة. اللہ تعالیٰ کے جملہ انبیاء ورسل نے جس دین کو قائم کرنے کی دعوت دی ہے اس کی اکثر اور اہم اور تعلیمات تین ہیں

پھر حضرت شاہ صاحب نے ان تین امور کی تفصیل و تعیین فرمادی ہے کہ وہ تین امور یہ ہیں:

(۱) تصحیح عقائد (۲) تصحیح اعمال (۳) تصحیح الاخلاق والاحسان۔

اس تعیین کے بعد حضرت شاہ صاحب تیسرے امر اخلاص و احسان پر مفصل بحث وکلام کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بیدہٖ هذا الثالث ادق المقاصد الشرعية مأخذاً و اعمقها محتداً بالنسبة الی سائر الشرائع بمنزلة الروح من الجسد وبمنزلة المعنی من اللفظ. وتكفل بها الصوفية رضوان الله عليهم فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوىٰ وحازوا السهم الاعلیٰ (۹)

---

(۹) تفہیمات الٰہیہ، ج ۱، ص ۱۳، بحوالہ تصوف و نسبت صوفیہ۔

اس ذات کی قسم کھا کے کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ امور ثلثہ میں سے یہ تیسرا امر مقاصد شرعیہ میں سب سے زیادہ باریک ودقیق اور سب سے زیادہ تہ نشین اور عمیق مقصد ہے شریعت کے دوسرے مقاصد اتنے عمیق ودقیق نہیں، یہ بمنزلہ روح ہے جسم کے مقابلہ میں اور لفظ کے پیش نظر یہ معنی کا درجہ رکھتا ہے، اور اس مقصد عمیق ودقیق کو حضرات صوفیہ نے اپنا میدان عمل بنایا، خود بھی ہدایت یاب ہوئے دوسروں کو بھی راہ یاب کیا خود بھی بادۂ عرفان سے سیراب ہوئے دوسروں کو بھی سیراب کیا اور انتہائی سعادت کے مقام پر فائز ہوگئے اور دین کا بڑا حصہ حاصل کرلیا۔

اب تک جن اکابر کی عبارات نقل کی گئیں ان کی حیثیت موضوع زیر بحث میں ان کے صوفی ہونے کی وجہ سے ایک فریق کی سی ہو جاتی ہے اور بعض مجلسی قسم کے انشاء پردازوں نے تو انہیں چنیا بیگم (افیونِ تصوف) سے شغل رکھنے والا بھی کہہ دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم یہاں ایک مسلم ومشہور صاحب افتا وفقیہ علامہ ابن عابدین شامی کے مقدمۂ شامی سے بھی کچھ اقتباسات نقل کردیں علامہ شامی صاحب درمختار کے قول (وعلم القلب) کے تحت فرماتے ہیں:

ای علم الاخلاق وھو علم یعرف بہ انواع الفضائل و کیفیۃ اکتسابھا وانواع الرذائل و کیفیۃ اجتنابھا — لما علمت من ان عالم الاخلاص والعجب والحسد والریاء فرض عین ومثلھا غیرھا من افات النفوس کالکبر والشح والحقد والغش والغضب والعداوۃ والبغضاء والطمع والبخل والبطر والخیلا والخیانۃ والمداھنۃ والاستکبار عن الحق والمکر والمخادعۃ والقسوۃ وطول الامل ونحوھا مما ھو مبین فی ربع المھلکات مِنَ الاحیاء قال فیہ وَلَا ینفَکُ عنھا بشر فیلزمہ ان یتعلم منھا ما یریٰ نفسہ محتاجاً الیھا وازالتھا فرض عین ولا یمکن الا بمعرفۃ حدودھا واسبابھا وعلاماتھا وعلاجھا فان من لایعرف الشر یقع فیہ۔(۱۰)

علامہ شامی علیہ الرحمہ کی مندرجہ بالا عبارت میں بھی تقریباً وہی باتیں کہی گئی ہیں جو اوپر بیان

(۱۰) مقدمہ شامی ص: ۴۳، ج:۱۔

کی جا چکی ہیں اس وجہ سے اس موقع پر عربی عبارت کا ترجمہ غیر ضروری سمجھ کر نہیں کیا گیا ہے، ان حوالہ جات سے مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ لوگوں کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ علم اخلاق وتصوف کی ضرورت واہمیت کے قائل صرف مشائخ وصوفیہ ہی نہیں ہیں بلکہ اپنے وقت کے مشہور صاحب مقام فقیہ ومفتی علامہ ابن العابدین شامی بھی اخلاق حسنہ کی تحصیل اور رذائل کا تزکیہ فرض شرعی بتا رہے ہیں۔

الحمد للہ کہ نفس تصوف وسلوک کی فرضیت وضرورت گذشتہ صفحات میں بفضلہٖ تعالیٰ حضرات مشائخِ کبار رحمہم اللہ تعالیٰ کی مستند تحریرات کے اقتباسات کی روشنی میں اطمینان بخش طور پر پیش کر دی گئی ہے امید کہ انصاف پسند حضرات کو اس روشنی میں صورت حق نمایاں نظر آ جائے گی۔

آئندہ سطور میں حضرت امام حجۃ الاسلام شیخ نانوتوی قدس سرہ کے سیر وسلوک اور عرفان واحسان سے متعلق محدود و ناقص معروضات پیش خدمت کی جا رہی ہیں خدا کرے ناچیز راقم سطور سے موضوع بحث کا حق کسی بھی درجہ میں ادا ہو جائے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

مشہور ہے: گاہ باشد کہ کودک ناداں از غلط بر ہدف زند تیرے

امام الاعلام حجۃ الاسلام حضرت محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی حیات روحانی واقعات وحالات کے آئینہ میں

احقر راقم السطور نے گذشتہ صفحات میں مولانا ضیاء الحق عثمانی کی مختصر ترین چند سطری ویک نظری سوانح اسی مقصد کے تحت ذکر کی تھی کہ اپنے موضوع پر کچھ لکھتے وقت احقر کے پیش نظر حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی مدت حیات بھی رہے اور پھر اسی مجموعی مدت حیات میں اپنی آنکھوں پر سلوک وعرفان کا چشمہ لگا کر حضرت قدس سرہ کے سلوک وعرفان کا سراغ لگایا جائے۔

حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی عمر ومدت حیات پچاس سال کی بھی پوری نہ تھی، مہینوں اور دنوں کا حساب لگا کر کہا جا سکتا ہے کہ عمر کا پچاسواں سال تھا جبکہ آپ نے دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر عالم آخرت کا سفر فرما لیا۔

احقر نے حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی مدت حیات (۴۹ سال) کے لیے تاریخی فقرہ نکالنا چاہا تو ''ایزد آگاہ'' کا فقرہ نکلا اس ''غیبی لطیفہ'' کو ''تفاءل'' کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اس کھلی ہوئی

حقیقت پر یہ الہامی فقرہ گواہ ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی ولایت و معرفت اور خدا شناسی وا یز دآ گاہی من جانب اللہ مؤید ہے۔

ناظرین کرام سے ایک ضروری واہم جملہ معترضہ عرض کرنے کی معذرت خواہی کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھانے سے پہلے کچھ پیچھے لوٹنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں مولانا ضیاء الحق عثمانی کی قلمبند کردہ چند سطری سوانح عمری پیش کی جا چکی ہے، مولانا موصوف نے اپنی اس مختصر سوانح میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تاریخ ولادت کی گتھی نہایت لطیف انداز میں حل کر دی ہے مگر خدا جانے کن وجوہ کی بنا پر (احقر کے محدود علم و مطالعہ کے مطابق) اب تک لوگوں کی نظر میں نہیں آسکی ہے، احقر کو اثنائے ترتیب مقالہ اس طرف توجہ ہوگئی تو مناسب یہی معلوم ہوا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تاریخ ولادت سے بحث اگر چہ راقم السطور کے موضوع سے متعلق نہیں ہے تاہم اسے بالکل غیر متعلق بھی نہیں کہا جائے گا اس لئے اس مختصر سوانح کا یہ جزو یہاں ذکر کیا جا رہا ہے موصوف نے لکھا ہے:

آپ کی عمر انچاس سال چار ماہ چار یوم ہوئی ظاہر ہے کہ جب مولانا ضیاء الحق صاحب کو حضرت امام قدس سرہ کی تاریخ وفات بھی معلوم ہے جس کے لحاظ سے وہ حضرت قدس سرہ کی مجموعی عمر (بقید سال و ماہ و یوم) انچاس سال چار ماہ چار یوم متعین طور پر بتا رہے ہیں تو اس حساب کو نظر میں رکھتے ہوئے ۴ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ سے ۴۹ سال ۴ ماہ، ۴ یوم پہلے کی تاریخ ہجری نکال لی جائے وہی تاریخ حضرت امام کی تاریخ ولادت متعین کی جاسکتی ہے۔

احقر بھی ''امۃ امیۃ'' ہی کا ایک فرد حقیر ہے حساب کتاب سے واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جو کچھ حساب بہ آسانی لگایا جاسکا ہے اس کی رو سے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ولادت آخر ذی الحجہ (۲۹۔یا ۳۰) ۱۲۴۸ھ متعین کی جاسکتی ہے اس لحاظ سے مجموعی عمر وہی بنتی ہے جو مولانا ضیاء الحق عثمانی نے بتائی ہے یعنی انچاس سال چار ماہ چار یوم ــــ الحمد للہ کہ اس طرح حضرت امام کی غیر متعین وغیر فیصل تاریخ ولادت بھی دریافت ہوگئی۔

اب تک حضرت امام قدس سرہ پر جو کتب سوانح لکھی گئی ہیں (حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی سوانح قاسمی سے لے کر مولانا گیلانی کی سوانح قاسمی اور مولانا اسیر ادروی کی مولانا

محمد قاسم: حیات اور کارنامے) ان سب ہی میں حضرت امام کی تاریخ ولادت متعین نہیں کی جاسکی ہے لیکن چونکہ مولانا ضیاء الحق صاحب نے مجموعی مدت عمر اور تاریخ وفات متعین طور پر لکھ دی ہے جس کی وجہ سے مجموعی عمر کا پہلا سرا (تاریخ ولادت) بھی دریافت کیا جاسکتا ہے جو دریافت کر کے اوپر درج کیا گیا ہے۔

اوپر اسی سوانح کی ضمن میں یہ بات بھی احقر لکھ آیا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کے سلوک واحسان کا سراغ لگانے کے لئے ضرورت پڑے گی کہ حضرت امام کی مجموعی عمر میں سلوک واحسان کے آثار کا جائزہ دقت نظر کے ساتھ لیا جائے۔

اس خیال کے تحت یہ ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ حضرت امام قدس سرہ کے عہد طفولیت کو بھی غور وتوجہ کے ساتھ نظر میں رکھا جائے جسے بالعموم ناز ونعمت کا دور کہہ کر نا قابل توجہ ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

ابتداءً احقر کا خیال یہی تھا کہ زیر نظر مقالہ میں ان حضرات شیخین کی بیعت کے تقدم وتاخر کو موضوع بحث نہ بنائے لیکن سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی نے اچھی خاصی بحث کرنے کے باوجود بحث کو یونہی ناتمام چھوڑ دیا ہے مجبوراً اس بحث میں شرکت ضروری سمجھی گئی ورنہ واقعہ یہی ہے کہ یہ بحث ایک طرح سے بالکل بے بنیاد اور غیر ضروری ہے، جن حضرات نے مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی تحریر کردہ سوانح بغور پڑھی ہے انہوں نے دیکھا ہے کہ اس کا فیصلہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی مختصر سوانح میں صاف وصریح الفاظ میں فرما گئے ہیں ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

> آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی مرحوم کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک طے کیا۔(۱۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یہ سوانح (مصنفہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی) حضرت امام قدس سرہ کی وفات کے بعد ہی قریب زمانہ میں لکھی گئی تھی اور جیسا کہ ابھی اوپر نقل کیا گیا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی معلومات حضرت امام نانوتوی وحضرت امام گنگوہی قدس سرہما کی بیعت وسلوک سے متعلق یہی ہیں، یہ روایت اس لحاظ سے زیادہ اہم اور قابل توجہ واعتنا قرار پاتی ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی حضرت امام نانوتوی کے استاد

---

(۱۱) سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ سوانح قاسمی مولانا گیلانی۔ص:۲۸۔

زادہ ہیں زمانۂ تعلیم دہلی میں حضرت امام نانوتوی انہیں کے ساتھ اپنے استاد ہی کے مکان پر رہتے تھے دونوں ہر وقت کے ساتھی اور ہمدم وہمساز تھے جس کی وجہ سے ان کی روایت صاحب البیت کی روایت ہونے کی وجہ سے بعد کی دوسری روایت کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول ٹھہرتی ہے۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے متعلق سلوک اور ذکر اذکار وغیرہ کی مشغولی اور اس کی مزید کیفیات وتفصیلات بھی اکثر وبیشتر انہی حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں۔

ایسی صورت میں کوئی معقول وجہ ہمیں اس بات کے لئے نہیں ملتی کہ ہم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ذکر واشغال کی تفصیلات تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی روایات سے لیں اور اہل سلوک وبیعت کے معاملہ کو تذکرۃ الرشید میں منقول روایات کی روشنی میں طے کرنے لگیں جبکہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی اس کے عینی شاہد بھی نہیں ہیں کیوں کہ موصوف کی پیدائش حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی وفات کے ایک سال بعد پانچ رجب ۱۲۹۸ھ کو ہوئی ہے اور حضرت گنگوہی قدس سرہ سے آپ کی بیعت ووابستگی ۱۳۱۶ھ میں ہوئی تھی ابھی بیعت کو صرف سات ہی سال گذرے تھے کہ ۸ یا ۹ جمادی الاخری ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بھی رحلت ہوگئی تھی۔

اس صورت حال کو نظر میں رکھتے ہوئے سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرات شیخین امام نانوتوی و محدث گنگوہی قدس سرہما کی بیعت کی وہ تفصیلات جو خدا جانے کن بنیادوں پر کہیں تذکرۃ الرشید اصل کتاب میں اور کہیں حاشیہ پر مذکور ہوگئی ہیں وہ کسی طرح بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی سوانح کی بالکل صریح وصاف اور واضح روایت کے ہم پلہ بھی نہیں کہی جاسکتیں چہ جائے کہ انہیں اس پر ترجیح دی جائے کیوں کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ جس زمانے سے متعلق یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ:

> اور اسی زمانے میں دونوں صاحبان (حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی) نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔ (۱۲)

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ خود حضرت مصنف سوانح اس وقت حضرات شیخین کے ساتھ ہی دہلی میں

---

(۱۲) سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص: ۲۸ مشمولہ سوانح قاسمی جلد: اول۔

ان حضرات کے استاذ اور اپنے والد محترم مولانا مملوک العلی صاحب علیہ الرحمہ کے مکان پر مقیم تھے بلکہ اسی زمانے میں عربی کی بعض ابتدائی کتابیں حضرت امام قدس سرہ سے پڑھی بھی تھیں اور حضرت امام نانوتوی نے جب کتب حدیث کا درس دینا شروع کر دیا ہے تو موصوف نے حضرت امام نانوتوی سے بخاری و مسلم شریف بھی پڑھی۔

ایسی صورت میں کہ مولانا محمد یعقوب صاحب جو ان حضرات کے اس درجہ قریب رہے ہوں ان کے بارے میں یہ بات سوچی بھی نہیں جا سکتی کہ انھوں نے ان حضرات کی بیعت سے صحیح واقفیت کے بغیر ہی ایسی صاف وصریح اطلاع یوں ہی سپرد قلم کر دی ہوگی مگر کیا کہا جائے کہ مولانا عاشق الٰہی کی تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر آئی ہوئی مندرجہ ذیل عبارت نے ایسی صاف بات کو بھی مستقل طور پر ایک موضوع بحث بنا دیا ہے، مولانا میرٹھی ص:۴۶ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا قاسم العلوم گو عقیدت میں حضرت گنگوہی سے مقدم ہیں مگر ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے، حضرت مولانا کو اعلیٰ حضرت سے بیعت ہونے کی جو کچھ بھی ترغیب دیتے اور حاجی صاحب کے مناقب بیان فرمایا کرتے تھے وہ اسی عقیدت کی بنا پر تھے جو نانوتہ کے ابتدائی تعلق قرابت و زیارت کے وقت سے آپ کو حاصل تھی، مولانا النانوتوی کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ پر بیعت کرانے میں کوشش کا ثواب بھی حضرت مولانا گنگوہی کو حاصل ہوا، چنانچہ حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا۔ (۱۳)

تذکرۃ الرشید کا مذکورہ بالا حاشیہ پڑھنے کے بعد اسی کتاب کے ص ۴۳ کا یہ حاشیہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے حاشیہ کی عبارت درج ذیل ہے:

> مسجد کی ملاقات کے بعد (مسجد کی یہ ملاقات کب ہوئی تھی بعد میں بتائی جائے گی) حضرت مولانا (گنگوہی) قدس سرہ اعلیٰ حضرت کی جائے قیام یعنی مولوی سراج الدین صاحب کے مکان پر حاضر ہوئے اور زیارت کی۔

اسی ملاقات یا گنگوہ کے کسی دوسرے سفر میں جو حضرت کی چوتھی ملاقات کہلاتی ہے۔ یہ قصہ

---

(۱۳) حاشیہ:۴۶ تذکرۃ الرشید۔

پیش آیا کہ اعلیٰ حضرت نے مولانا (گنگوہی) قدس سرہ سے دریافت فرمایا کہ:

میاں رشید احمد! اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی بھی تمنا ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا نے جواب دیا کہ "حضرت! جی تو بہت چاہتا ہے" آپ (حضرت حاجی صاحب) نے دریافت فرمایا کہاں؟ اور کس کی طرف میلان ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ حضرت اب تک جتنا بھی غور و فکر کیا دو حضرات میں سے ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا اور یا آپ کا، اعلیٰ حضرت مسکرائے اور یہ فرما کر بات کو ٹال دیا کہ ہاں صاحب شاہ عبدالغنی صاحب عالم بھی ہیں۔ شیخ بھی مشہور محدث ہیں۔ علماء تو علماء ہی کی طرف جھکتے ہیں، مجھے کیوں شامل کرتے ہو؟ میں بیچارہ پڑھا نہ لکھا— حضرت مولانا (گنگوہی) قدس سرہ فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت نے بظاہر تو اپنی طرف سے رغبت کم کی مگر اندر ہی اندر دل کو کھینچ لیا، اس گفتگو کے بعد آپ کا خیال آستانہ امدادیہ کی جانب پختہ ہو گیا جس کا چند روز بعد وقوع ہو گیا۔ (۱۴)

راقم السطور رومی عرض کرتا ہے کہ مذکورہ بالا حاشیہ میں مسجد کی جس ملاقات کا ذکر ہوا ہے اس ملاقات کا ذکر اصل کتاب تذکرۃ الرشید میں ص ۴۲ پر مفصل مذکور ہے وہ تفصیل تو غیر ضروری ہے تاہم اس ملاقات سے متعلق یہ مختصر و ضروری انکشاف اہم اور قابل ذکر ہے کہ تھانہ بھون کی مسجد کی یہ ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب یہ ہر دو حضرات شیخین دہلی میں طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔

ایسی صورت میں بظاہر صوفی محمود حسن صاحب سہارنپوری کی منقولہ بالا روایت کو اگر حضرت حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی کی تیسری ملاقات قرار دے لیا جائے تو متعدد روایات میں تطبیق کی صورت بھی نکل آتی ہے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی بیان فرمودہ حقیقت واقعہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی اور واقعہ کی صورت یہ قرار پاتی ہے کہ صوفی محمود حسن صاحب سہارنپوری کی روایت کے مطابق حضرت حاجی صاحب قدس سرہ اور حضرت گنگوہی کے درمیان یہ ملاقات و مکالمہ بیعت سے پہلے اس وقت ہو چکا ہے جب حضرات گنگوہی و نانوتوی دہلی میں طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے، قیام دہلی کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا جس کے نتیجہ میں حضرت گنگوہی کا وہ تردد بین الشیخین ختم ہو گیا جو بوقت مکالمہ ظاہر ہوا تھا اور پھر آپ نے دوسری طرف سے یکسو ہو کر

(۱۴) حاشیہ از صوفی محمود حسن سہارنپوری۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے بیعت کا فیصلہ فرمالیا اور پھر حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے درس حدیث کی تکمیل کے بعد ہے دونوں صاحبان حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے اور سلوک بھی شروع کر دیا۔

اس بیعت کے وقوع میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کے شاکلہ وافتادِ طبع کے لحاظ سے عین ممکن ہے کہ دونوں صاحبان کی بیعت بالکل ایک ساتھ نہ ہوئی ہو اور حضرت گنگوہی کے ارشاد کے مطابق صورت وہی ہوئی ہو کہ ہر دو حضرات کی بیعت میں فی الجملہ تقدم و تاخر بھی ہوا ہو۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے خصوصی شاکلہ وافتادِ طبع پر نظر رکھتے ہوئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس تقدم و تاخر کو میری و پھسڈی کے چشمہ سے دیکھا جائے کیونکہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کا شاکلہ خصوصی اور حضرت کی افتادِ طبع کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ وہ ہر ایسی بات سے دور رہنا چاہتے تھے جس میں ادنیٰ شائبۂ شہرت اور داعیۂ نام و نمود پایا جائے۔

حضرت امام نانوتوی کے سوانح کا یہ پہلو کھل کر زیر بحث نہیں آسکا ہے کہ حضرت نے دہلی کے عربک کالج میں پڑھنے کے باوجود سالانہ امتحان کی شرکت سے کیوں گریز کیا تھا؟ وجہ ظاہر ہے کہ امتحان دیتے تو ٹاپ کرتے مگر یہ شہرت وہاں مطلوب ہی کسے تھی؟ اس لئے چپ چاپ کالج چھوڑ دیا اور گھر بیٹھے رہے۔

جن حضرات نے صرف ظاہری طور پر رسم بیعت کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر اور اولیت و ثانویت کو ایک بالکل غیر ضروری موضوع بحث بنا کر ان حضرات شیخین میں تفریق و تفصیل کی صورت پیدا کر دی ہے انہوں نے ان دونوں بزرگوں کے ربط باہم اور مودت و خلوص ہی کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ضمنی طور پر حقیقت بیعت سے بھی اپنی بے خبری بھی ظاہر کر دی ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرات مشائخ طریق بھی بیعت کو مفید و مستحسن ہی قرار دیتے ہیں اسے ضروری و فرض کا درجہ تو کوئی بھی نہیں دیتا ہے۔

بیعت کی یہ حقیقت اگر چہ ان حضرات مشائخ کی تحریرات سے بھی مفہوم ہو جاتی ہے جن کے حوالہ سے تصوف و سلوک کی شرعی حیثیت گذشتہ صفحات میں مفصل و قابل اطمینان حد تک بیان کی جا چکی ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بالعموم لوگوں میں خدا جانے کیوں یہ غلط فہمی عام

طور پر پائی جاتی ہے کہ جو لوگ کوچۂ سلوک وتصوف میں قدم رکھنا چاہتے ہیں وہ اصل سلوک یعنی اصلاح باطن کی طرف تو قطعاً توجہ ہی نہیں کرتے، ان کی پہلی اور آخری منزل بیعت اور صرف بیعت ہی ہوتی ہے اور بیعت ہو کر وہ پھر یوں سو جاتے ہیں جیسے گھوڑوں کا سوداگر گھوڑا بیچ کر سو جایا کرتا ہے۔

اگرچہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ (جنہیں علمائے عصر نے سلوک وتصوف میں تو بہر حال مجدد مانا ہی ہے) نے بیعت رسمیہ کے معاملہ میں پھیلی ہوئی اور پائی جانے والی اس مشہور عام غلط فہمی کا صاف اور واضح انداز میں ازالہ فرمادیا ہے لیکن مدتوں کی جڑ پکڑی ہوئے غلط فہمی پوری طرح دور نہیں ہوسکی ہے چنانچہ صاحب تذکرۃ الرشید کا ذہن بھی پوری طرح صاف معلوم نہیں ہوتا جنہوں نے بالکل غیر ضروری طور پر یہ بحث چھیڑ دی اور ان ہر دو حضرات شیخین کو طرفین وفریقین کی حیثیت دے کر ان کی بیعت کے تقدم وتاخر کو ایک نزاعی اور قابل فیصلہ مقدمہ بنادیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی امام دوسرے وابستگان دار العلوم ومظاہر علوم کے غیر متنازع فیہ متفقہ طور پر امام وسید الطائفہ کی حیثیت رکھتے ہیں یہ حضرات شیخین اپنے مخصوص شاکلہ اور خصوصی افتاد طبع کے لحاظ سے باہم دگر اگرچہ فی الجملہ مختلف بھی ہیں مگر اس کے باوجود ایک دوسرنے کے صحیح معنی میں مقام شناس بھی ہیں ہر دو بزرگ اپنی سلامتِ طبع کے باعث اس جذبۂ معاصرت سے بالکل پاک وصاف تھے جو معاصرت کو منافرت میں تبدیل کردیا کرتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ تذکرۃ الرشید کے حاشیہ کی منقولہ بالا عبارت نے اس موضوع بحث کو اس انداز سے پیش کردیا ہے جس سے کچھ ایسا رنگ جھلکتا ہے کہ قاسمی ورشیدی یہ الگ الگ دو گروپ ہیں اور ہر گروپ ہیرو وشپ میں مبتلا ہے اور اس کی پوری کوشش صرف یہ ہے کہ اس کا ہیرو زندگی کے ہر میدان وہر مرحلہ میں اول نمبر پر رہے۔

یہ جذبہ مغرب میں خواہ کتنا ہی پسندیدہ قرار دیا جاتا ہو اسلام میں اس قسم کی ہیرو وشپ نہ صرف یہ کہ بالکل بے قیمت ہے بلکہ انتہائی قابل مذمت ولائق نفرت جذبہ ہے جس کی حوصلہ افزائی کسی طور پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اسلامی ادب کے مسلم صاحب قلم ہیں ان کی نکتہ آفرینی ونکتہ سنجی، ژرف نگاہی ودور بینی طبقہ اہل علم میں مسلم ہے لیکن سوانح قاسمی میں وہ اپنی ان نکتہ آفرینیوں کی رو میں بار بار کچھ اس طرح بے قابو ہو کر الجھ جاتے ہیں کہ بعض مقامات پر ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ

اپنی اسی رو میں تضاد بیانی سے صحیح طور پر اپنا دامن بچانے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں، یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے یہ دوسرے مستقل مضمون کا موضوع ہے۔

مولانا گیلانی صاحب نے تذکرۃ الرشید کی زیر تبصرہ بحث سوانح قاسمی جلد اول کے ص: ۲۹۳ سے شروع کی ہے جو تقریباً آٹھ صفحات تک چل کر ص ۳۰۰ پر ختم ہوئی ہے۔ اس طویل سلسلۂ کلام کا ایک اقتباس ذیل میں اپنے تبصرہ کے ساتھ پیش خدمت کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا گیلانی تذکرۃ الرشید ص ۴۶ پر دیئے ہوئے حاشیہ کی عبارت نقل فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''یہ ایک روایت ہے اور ثقہ، قابل اعتبار راوی کی روایت ہے بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا گویا چشمہ کا سراغ جس نے لگایا تھا باوجود پیاس کے اس وقت تک اپنے تلاش کئے ہوئے پانی کو اس نے استعمال کرنا مناسب نہ خیال کیا جب تک کہ دوست کو نہ دیکھ لیا کہ وہ سیراب ہو چکا ہے''۔ (۱۵)

مولانا گیلانی نے مندرجہ بالا اقتباس میں جو کچھ فرمایا ہے وہ عقلی و منطقی اعتبار سے مخدوش ہے، جن مقدمات پر مولانا نے اپنے نتیجہ کی بنیاد رکھی ہے وہ اپنے ناقص ہونے کی وجہ سے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے لیکن مولانا نے اپنے مقدمات کے نقص کو نظر انداز کر کے بالکل ہی زبردستی ان سے نتیجہ نکال لیا ہے جسے اہل منطق تحکم ہی کہیں گے۔

مولانا کا یہ ارشاد تو اپنی جگہ پر درست ہے کہ یہ ایک روایت ہے اور ثقہ، قابل اعتبار راوی کی روایت ہے، مگر اس موقع پر مولانا کو اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ دوسرا مقدمہ (کبریٰ) بھی ذکر کر دینا چاہئے تھا کہ اس روایت کے علاوہ کوئی دوسری روایت جو اس سے زیادہ قوی ہو موجود بھی نہیں ہے — لیکن مولانا نے یہ بات نہیں کہی اور وہ کہہ بھی کیسے سکتے تھے کہ خود انہیں کے متعین کردہ متن (یعنی سوانح قاسمی از مولانا محمد یعقوب نانوتوی) میں مولانا عاشق الٰہی کی روایت سے کہیں زیادہ وزنی، صحیح و قوی روایت موجود ہے کہ:

---

(۱۵) سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۲۹۴۔

''اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا''۔(۱۶)

پھر مولانا گیلانی کا آگے بڑھ کر یہ فرمانا کہ:

بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا۔

موصوف کا یہ نتیجہ بھی عقلی و منطقی طور پر نا قابل تسلیم ہے یہ انداز استدلال حد درجہ ضعیف و کمزور ہے، اس کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر خدا جانے کتنی غلط باتوں کو صحت کی سند دینی پڑ جائے گی۔

عقلی طور پر یہی بات نا قابل تسلیم ہے کہ تذکرۃ الرشید شائع ہو جانے پر اس وقت کے موجود اکابر نے اسے بنظر غائر از راہ تنقید پڑھا بھی ہو بلکہ مشاہدہ و تجربہ کی روشنی میں یہی دوسرا پہلو قابل ترجیح ثابت ہوتا ہے کہ ان بڑے حضرات کی اپنی ذاتی مشغولیات و مصروفیات ہی اس قدر ہوتی ہیں جن میں ایسے کاموں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اس لئے ایسے حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ تذکرۃ الرشید کی اشاعت کے بعد انہوں نے بہ نظر غور و تنقید اس کے تمام تر مندرجات حرفاً حرفاً پڑھے ہوں گے بظاہر اسے توقع بے جا ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب اسی سلسلۂ بحث کا ایک دوسرا اقتباس اسی سوانح قاسمی کا ملاحظہ ہو۔ مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

اور جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا بظاہر مولوی عاشق الٰہی صاحب کی اس خبر کے مشتبہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، البتہ ایک چیز اس سلسلہ میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے ——

چند فقروں کے بعد —— مصنف امام ہی کے قلم مبارک سے ایک فقرہ یہ بھی نکل پڑا ہے:

اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا (ص:۲۸)

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''طلب حدیث'' ہی کے زمانے میں دونوں صاحبوں کو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے باضابطہ بیعت ہی کا نہیں بلکہ سلوک باطنی کی تربیت پانے کا شرف حاصل

(۱۶) سوانح قاسمی ج:۱، ص:۲۸۔

ہو چکا تھا آگے پیچھے اس فقرے کے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک مولانا مملوک العلی صاحب دونوں حضرات کے استاد فنون زندہ تھے، مصنف امام کے اس بیان کو اور اس کے سابقہ ولاحقہ مضامین کو دیکھتے ہوئے دل میں بعض عجیب قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں خصوصاً حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جن تفصیلات کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جن سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام علوم اور علم حدیث وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد گنگوہ میں آکر جب مولانا گنگوہی نے قیام اختیار فرمایا اور کچھ درس وتدریس اور ''نوشت وخواند'' کے مولویانہ کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے تب وہی مولانا شیخ محمد تھانوی کے مناظرہ کا قصہ پیش آیا اور مناظرے کے حیلہ سے تقدیر تھانہ بھون آپ کو حاجی صاحب کے قدموں تک پہنچا دیتی ہے مگر مصنف امام کے فحویٰ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کا زمانہ دونوں بزرگوں کا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ حاجی صاحب سے دونوں مرید ہو گئے اور سلوک میں بھی لگ گئے بظاہر ان دونوں روایتوں میں تطبیق آسان نہیں ہے اور بجائے تطبیق کے ترجیح کا طریقہ اگر اختیار کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے مصنف امام کی روایت ہر لحاظ سے مولوی عاشق الٰہی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں ترجیح کی زیادہ مستحق ہے۔(۱۷)

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مولانا گیلانی پھر اپنی پرانی گومگو والی کیفیت پر لوٹ گئے ہیں اور پھر تذکرۃ الرشید کی روایت میں انہیں کافی قوت نظر آنے لگتی ہے بلکہ وہ پھر دوبارہ اس غلط استدلال کا سہارا لینے میں بھی تامل نہیں فرماتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> اس (تذکرۃ الرشید) کے شائع ہونے کے بعد بھی جہاں تک میں جانتا ہوں اس کتاب کے بیانات پر کسی سمت سے تنقیدی صدا چونکہ نہیں اٹھی اس لئے یہ بھی مشکل ہے کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کی تفصیلات میں شک اندازی کی جائے، پس مناسب یہی ہے کہ تطبیق کا طریقہ اختیار کر کے تاویل وتوجیہ کی کوئی راہ نکالی جائے جس کی جہاں تک میرا خیال ہے، کافی گنجائش ہے لیکن اس مسئلہ کا زیادہ تر تعلق حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعۂ بیعت سے ہے نیز غیر ضروری طوالت کا بھی خوف ہے اس لئے تاویل وتوجیہ کے اس کام کو پڑھنے والوں کے ذاتی

---

(۱۷) سوانح قاسمی ج:۱،ص:۲۹۹۔

مذاق کے سپرد کر کے جو کچھ مجھے یہاں عرض کرنا ہے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں (انشاء اللہ تعالیٰ وبعونہ راقم السطور یہ فریضہ آئندہ سطور میں عنقریب ہی ادا کرنے کی کوشش کرے گا، ابھی تو مولانا گیلانی کی بات پہلے پوری ہو جائے موصوف فرماتے ہیں)

کہنا یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خواہ جو صورت بھی پیش آئی ہو لیکن اپنے مصنف امام (حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ) کی مذکورہ روایت اور اس کے سابقہ ولاحقہ فقروں کی روشنی میں بہ ہر حال اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں کم از کم سیدنا الامام الکبیر ضرور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صرف حلقۂ ارادت ہی میں شریک نہیں ہو چکے تھے بلکہ مصنف امام کے الفاظ کا اقتضا یہی ہے کہ باطنی سیر وسلوک کے مشاغل میں بھی حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا۔ (۱۸)

تذکرۃ الرشید کی داستان بیعت کی تنقیح وتنقید:

اس مقصد کے تحت یہاں کچھ معروضات پیش خدمت ہوں گی مگر اس سے پہلے اپنے ہی ایک دعویٰ کا ثبوت پیش کر دینا برمحل ہوگا، گذشتہ صفحات میں احقر راقم السطور نے جب حضرت مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کے اس انداز استدلال کی صحت میں تامل کا اظہار کیا ہے کہ ــــ بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا تھا۔

تو احقر نے وہاں لکھا ہے کہ عقلی طور پر یہی بات نا قابل تسلیم ہے کہ تذکرۃ الرشید شائع ہو جانے پر اس وقت کے موجود اکابر نے اسے بہ نظر غائر از راہ تنقید پڑھا بھی ہو بلکہ مشاہدہ وتجربہ کی روشنی میں تو یہی دوسرا پہلو قابل ترجیح ثابت ہوتا ہے کہ ان بڑے حضرات کی اپنی ذاتی مشغولیات ومصروفیات ہی اس قدر ہوتی ہیں جن میں ایسے کاموں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

اب اس موقع پر احقر اپنی بات کے ثبوت میں یہ سوال اہل نظر واصحاب انصاف کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی ولادت ۱۲۹۸ھ میں ہوئی ہے جبکہ اس سے ایک سال پہلے حضرت امام نانوتوی دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے تقریباً

(۱۸) سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۳۰۰

چودہ سال بعد ۱۲۹۷ھ میں وفات پا چکے تھے اور ان کی وفات کے متصل ہی زمانے میں حضرت امام نانوتوی کی مختصر سوانح عمری حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی تصنیف فرما چکے تھے جن کی وفات بھی جلد ہی یعنی ۱۳۰۵ھ میں ہوگئی تھی۔

اس موقع پر سوال یہ ہے کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے جب حضرت گنگوہی قدس سرہ کی سوانح تذکرۃ الرشید لکھنے کا ارادہ کیا تو اس وقت انہوں نے کیا یہ ضرورت محسوس کی تھی کہ وہ اپنے اس مقصد کے لئے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصنیف کردہ سوانح عمری مولانا نانوتوی کا بھی مطالعہ فرمالیں جو ان کے شیخ حضرت گنگوہی کے اصل رفیق وصدیق ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مرتبہ شناس بھی تھے؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مولانا میرٹھی نے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصنیف کردہ سوانح عمری کا مطالعہ یا تو کیا ہی نہیں اور اگر کیا بھی تو بہ نظر غائر نہیں کیا؟ ورنہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی مختصر سوانح قاسمی کا یہ انکشاف ان کی نظر سے گزر جانا چاہئے تھا کہ:

> اور اسی زمانہ میں (جس زمانہ میں ان حضرات نے شاہ عبدالغنی صاحب سے تکمیل حدیث کی تھی) دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا (ص:۲۸)

تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ''داستان بیعت''، جس طرح قلم بند ہوئی ہے اس سے بالکل عیاں ہے کہ مولانا میرٹھی کے علم میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کا یہ صریح وصاف انکشاف مطلق نہیں تھا ورنہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ''داستان بیعت'' کے دوران کوئی ایک حاشیہ اس انکشاف کی تردید میں ہونا ضروری تھا کیونکہ یہ انکشاف ایک ایسی شخصیت کے قلم حقیقت رقم سے تھا جو مروجہ پرتکلف انشاء صحافت سے یکسر پاک ہونے کی وجہ سے نظر اندازی کے لائق ہرگز نہ تھا۔

اس تفصیل سے احقر کا مدعا واضح ہو جاتا ہے کہ جب تذکرۃ الرشید کے فاضل مصنف اپنے تذکرہ نگاری کے وقت بھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں فرماتے کہ اپنے شیخ ومرشد کے حقیقی ساتھی حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے متعلق لکھا ہوا وہ تذکرہ بھی دیکھ لیں جو جس طرح حضرت امام نانوتوی کا زمانہ تعلیم وقیام دہلی میں ہمدم و دمساز تھا، اسی طرح اور تقریباً اسی درجہ کا تعلق اسے حضرت

گنگوہی سے بھی حاصل تھا اس لئے کسی کتاب کو سند تصدیق دینے کے لئے یہ حسن ظن کافی نہیں ہے کہ اس کتاب پر کسی جانب سے صدائے تنقید نہیں اٹھی تھی — اس ضروری معروض کے بعد تذکرۃ الرشید کی روایت سے متعلق معروضات پیش خدمت کی جارہی ہیں خدائے تعالیٰ راقم السطور کی مدد فرمائے اور قلم کو حقیقت نگاری کی حد سے باہر نہ ہونے دے۔

معاملہ ومقدمہ کی نوعیت کیا ہے

تذکرۃ الرشید کی مفصل داستان بیعت پر کچھ تنقید وتبصرہ کرنے سے پہلے حقیقت نگاری کا تقاضا یہی ہے کہ نوعیت معاملہ ومقدمہ متعین ہوجائے اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

احقر ہیچمداں کے فہم ناقص کے مطابق معاملہ ومقدمہ کی نوعیت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ:

جملہ وابستگان دیوبند کے مسلم ومتفق علیہ امام وپیشوا اور بزرگان دین ہیں امام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ اور ان کے رفیق خاص فقیہ النفس محدث عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی — ہر دو بزرگوں کی عمر میں چار سال کا فرق ہونے کے باوجود یہ صورت اتفاق بھی نکل آئی کہ تقریباً تمام تر درسیات دونوں ہی بزرگوں نے ایک ساتھ اور ایک ہی استاذ سے پڑھیں اور ایک ساتھ ہی دونوں نے تکمیل درس کی۔

حدیث شریف کی تکمیل حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں ہوئی اور دوسرے علوم وفنون کا بیشتر حصہ مولانا مملوک العلی صاحب اور مفتی صدرالدین صاحب آزردہ دہلوی کی خدمت میں پڑھا تھا اور اسی طالب علمی ہی کے زمانے میں دونوں ہی بزرگ حضرت حاجی امداداللہ صاحب سے بیعت بھی ہوگئے تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں حجۃ الاسلام امام نانوتوی قدس سرہ نے انچاس سال چار ماہ چار دن کی عمر میں وفات پائی حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ اس وقت ترپن سال کی عمر میں بقید حیات تھے جو حضرت امام کی وفات کے بعد دارالعلوم کے سرپرست ومربی رہے۔

امام نانوتوی کی وفات کے بعد ہی متصلاً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدرالمدرسین دارالعلوم نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی مختصر سوانح عمری تصنیف فرمائی جس میں اصلاً تو حضرت امام نانوتوی کے ضروری احوال نہایت درجہ اختصار کے ساتھ قلم بند فرمادیئے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے صدیق ورفیق حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کی تعلیمی رفاقت کا ذکر بھی کرتے گئے — انہیں تفصیلات

میں یہ واقعہ بھی قلم بند ہو گیا کہ جس زمانے میں ان دونوں بزرگوں نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے کتب حدیث کی تعلیم پوری کی ہے اسی زمانے میں ان دونوں ہی بزرگوں نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت بھی کی اور سلوک شروع کر دیا۔

حضرت امام نانوتوی کی اس مختصر سوانح عمری کی اشاعت کے تقریباً پچیس سال بعد تک حضرت گنگوہی بقید حیات رہے اور ہر دو حضرات کی رفاقت وصداقت کے پیش نظر گمان غالب یہی ہے کہ حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ اگر عذر نابینائی کی وجہ سے یہ سوانح ملاحظہ نہ فرما سکے ہوں گے تو بھی اسے سنا تو ضرور ہوگا اور اگر اس کی کوئی بات حضرت کو خلاف واقعہ لگی ہوگی تو اس پر متنبہ بھی ضرور فرمایا ہوگا — مگر ایسی کوئی بات کہیں منقول نہیں ہے۔

پھر حضرت امام گنگوہی قدس سرہ کی وفات کے چند سال بعد تذکرۃ الرشید (سوانح حضرت گنگوہی قدس سرہ) منظر عام پر آئی اس کتاب میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے "سلوک وتحصیل طریقت" کے عنوان سے ص ۴۰ سے ص ۴۹ تک تقریباً دس صفحات میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کی "روداد بیعت" قلم بند کی گئی ہے روداد کا بیشتر حصہ تو اصل متن کتاب میں مذکور ہے لیکن بعض بعض مقامات پر چند حاشیوں میں بھی انکشافات واطلاعات درج ہیں۔

تذکرۃ الرشید کے اس عنوان کے تحت حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے حضرت گنگوہی کی بیعت سے متعلق جو تفصیلات مذکور ہیں ان کی وجہ سے ان حضرات کی سیدھی سادی بیعت کا وہ معاملہ جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی تصنیف کردہ سوانح میں غیر اختلافی سمجھا جارہا تھا ایک نہایت درجہ اہم اختلافی مسئلہ کی شکل میں سامنے آ گیا لیکن یہ اختلاف روایات شاید ایک عرصہ تک موضوع بحث نہ بن سکا تھا یہاں تک کہ پورا ایک دور اس طرح گزر گیا اور دونوں تذکروں میں دو علیحدہ علیحدہ روایات دبی پڑی رہیں۔

تذکرۃ الرشید کی اشاعت پر تقریباً پچاس سال گزرنے کو تھے کہ ارباب دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے ذریعہ سوانح قاسمی تین جلدوں میں مرتب کرا کے اسے دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ۱۳۷۳ھ میں شائع کر دیا۔

حضرت مولانا گیلانی کی نکتہ سنجی ودقیقہ رسی اہل علم واہل قلم میں مسلم ہے، موصوف نے شاید

پہلی بار اپنی مرتبہ سوانح قاسمی میں اس غیر ضروری قضیہ کو ایک ''مقدمہ'' کی صورت میں پیش کیا اور اپنے مخصوص انداز میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ کسی فیصلہ ونتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کامیابی کی صورت نظر نہیں آسکی تو تطبیق وتوجیہ کو پڑھنے والوں کے ذاتی مذاق کے سپرد کر کے آگے بڑھ گئے۔

اب احقر کو اپنے مجوزہ ومفوضہ مقالہ نگاری کے دوران جب اس پیچیدہ مسئلہ کو سمجھنے سمجھانے کی ضرورت پڑی تو احقر کو بھی اس بیل کو منڈھے چڑھانا دشوار نظر آرہا ہے اور بجا طور پر یہ احساس ہو رہا ہے کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ مولانا گیلانی ہی کر گئے ہوتے مگر افسوس کہ یہ کام ہو نہ سکا۔

اصل دشواری یہ ہے کہ یہ خالص تاریخی معاملہ ہے جو دو مختلف قسم کی عقیدت مندیوں کے حصار میں جکڑا ہوا ہے اگر تاریخی وروایتی معیار پر اس مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو وہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے (جو آئندہ سطور میں پیش خدمت ہوگا) مگر دشواری یہی ہوگی کہ اس فیصلہ میں غیر ضروری و بیجا عقیدت مندی کی قربانی ضرور ہو جائے گی۔

اصولی طور پر مقدمہ کا حل تو یہی ہو سکتا ہے کہ یہ مقدمہ دو علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے متضاد روایات کا مقدمہ ہے جن میں تطبیق وتوجیہ کی راہ بالکل بند ہے ایسی صورت میں کوئی فیصلہ ہر دو روایات کے ضعف وقوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا جانا چاہئے جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے۔

اس اصول کے پیش نظر شاید ہی کوئی صاحب الرائے اہل علم اس فیصلہ سے اختلاف کرے کہ روایت کے ضعف وقوت کی جہت سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی روایت متعدد وجوہ سے لائق ترجیح اور قابل قبول ہے کہ اس روایت کے راوی حضرت مصنف بذات خود ہیں جو ہر دو بزرگوں کے استاذ زادے اور ہر وقت کے رفیق وجلیس بھی ہیں، ان کے استاذ شریک بھائی بھی ہیں اور ان کے پیر بھائی بھی ہیں۔

اس کے برخلاف تذکرۃ الرشید کی داستان بیعت کی روایت میں متعدد اضطرابات ہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب کو صحیح طور پر یہ بات بھی محفوظ نہیں ہے کہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کی ملاقاتیں بیعت سے پہلے کتنی ہوئیں اور کہاں اور کب ہوئیں۔

چنانچہ احقر نے تذکرۃ الرشید ص: ۴۳ کے حاشیہ پر منقول ہوئی محمود حسن کی روایت کے ذکر

کے ساتھ اپنا رجحان ذکر کر دیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے مابین بیعت سے متعلق ایک مکالمہ ان حضرات کی طالب علمی ہی کے دور میں ہو چکا تھا جس نے حضرت گنگوہی کو یکسو کر کے حضرت حاجی صاحب سے وابستہ ہونے کے لیے پوری طرح آمادہ کر دیا تھا جس کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اس مکالمہ کے بعد ہی اثنائے طالب علمی میں حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے تھے۔

ایسی صورت میں حضرت حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی کی تاخیر بیعت کی کوئی معقول وجہ نہ تو کسی نے بیان کی ہے اور نہ ہی سمجھ میں آتی ہے۔ احقر کو اپنے قصور علم وفہم کا اعتراف ہے اور کسی طرح اپنے چھوٹے منہ سے کوئی بڑی بات کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے، پھر معاملہ بھی ایسا ہے جس سے لوگوں کی عقیدت مندیاں وابستہ ہیں لیکن آیت کریمہ اعدلوا هو اقرب للتقوىٰ اور مقولہ حکیمانہ: ''انصاف شیوۂ ایست کہ بالائے طاعت است'' پر عمل کرتے ہوئے احقر نہایت ادب کے ساتھ اس صاف گوئی کی اجازت چاہتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ تذکرۃ الرشید کی متنازعہ روایت میں احقر کے نزدیک کچھ خلط ہو گیا ہے اور دو مختلف واقعات کو ایک ہی روایت میں جمع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان حضرات کی بیعت کا سیدھا سادہ معاملہ ''عقدہ لاینحل'' بن کر رہ گیا ہے۔

احقر کے فہم ناقص کے مطابق صورت واقعہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان ہر دو حضرات کی بیعت کا زمانہ تو زمانۂ تعلیم ہی میں مانا جائے جیسا کہ ان حضرات کے ہمہ وقتی جلیس و رفیق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ارشاد فرما رہے ہیں اور حضرت شیخ محمد صاحب محدث تھانوی علیہ الرحمہ سے مناظرہ کے واقعہ کو واقعۂ بیعت سے جوڑ کر دیکھا جائے۔

اس مرتبہ کی حاضری جو اصلاً بہ نیت مناظرہ ہی تھی لیکن حضرت حاجی صاحب کی ناپسندیدگی کے بعد آپ نے اچانک اصلاح اخلاق اور سلوک طریقت کا فیصلہ فرما لیا اور امروز وفردا پر ٹلتے ٹلتے یہ قیام پورے ایک چلہ تک ممتد ہو گیا جو لوگ حضرت حاجی صاحب سے آپ کی ابتدائی بیعت سے باخبر نہ تھے انہیں یہی اندازہ ہو سکا کہ آپ نے اس موقع پر بیعت کی ہے۔

تذکرۃ الرشید اور اس کے حاشیوں کی روایات کو اگر بعینہ طور پر درست وصحیح مان لیا جاتا ہے تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جن کی مختصر سوانح عمری اور سوانح مخطوطہ وغیرہ کے کتنے ہی مندرجات بے محل ہو جائیں گے جن میں حضرت امام نانوتوی کے وہ مجاہدات وریاضات بڑی تفصیل

سے بیان کئے گئے ہیں جو حضرت امام نے قیام دہلی کے زمانے میں انجام دیئے تھے (جن کا ذکر عنقریب ملاحظہ میں آئے گا)

تذکرۃ الرشید میں اس بحث سے متعلق جو مندرجات ہیں ان میں کا بیشتر حصہ تو مولانا عاشق الٰہی کے ''مدرجات'' کی وجہ سے بڑی حد تک اپنی استنادی حیثیت سے کمزور ہو گیا ہے لیکن ص:۴۶ کے حاشیہ کا درج ذیل فقرہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ذات والا صفات تک مرفوع ہو جانے کی وجہ سے پوری طرح مستند ہے کہ:

چنانچہ حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا۔ (۱۹)

صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ کلمات حضرت امام گنگوہی کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے ہیں اور یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ کلمات بطور تفنن و مزاح دوستانہ ارشاد فرمائے گئے ہیں ''میری'' اور ''پھسڈّی'' والے جذبہ کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی دور دور تک نہیں ہے۔

علاوہ ازیں صرف مذکورہ بالا روایت میں پوری پوری گنجائش اس بات کی موجود ہے کہ اسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی سوانح عمری والی روایت کے ساتھ جمع کر لیا جائے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے اس کی تفصیل یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ ہر دو بزرگوں کی بیعت زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گئی ہو اور ان دونوں کی بیعت میں فی الجملہ تقدم و تاخر بھی ہو گیا تو کسی کو کیا اشکال ہے اوپر یہ بات اشارتاً عرض کر آیا ہوں کہ حضرت امام کے شاکلہ اور افتاد طبع کا تقاضا ہی یہی تھا کہ وہ جس طرح علم و حکمت کا ننگ و نام اپنے لئے پسند نہیں فرماتے تھے تو مرید ہو کر پیر بننے کے امکانات کو کیسے ہنسی خوشی اور جلدی سے گوارا فرما سکتے تھے۔

سوانح قاسمی کا یہ الجھا ہوا معاملہ جو بالکل غیر ضروری طور پر نزاعی موضوع بحث بن گیا تھا، اوپر کی معروضات میں کوشش کی گئی ہے کہ اس کا قابل اطمینان حل نکل آئے۔

خدائے تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے جہاں تک احقر کے فہم ناقص کی رسائی ہے یہی

(۱۹) حاشیہ ص:۴۶ تذکرۃ الرشید

سمجھ میں آتا ہے کہ معروضات بالا میں ہر دو بزرگوں کی بیعت کا معاملہ اور پھر ان میں تقدم و تاخر کی غیر ضروری بحث اطمینان بخش طور پر صاف ہوگئی ہے۔

اس موقع پر احقر کی کوشش یہی رہی ہے کہ اس گتھی کو حل کرنے میں بنیادی اہمیت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی مختصر سوانح قاسمی کو دی جائے کہ اس سوانح کی اہمیت اور اس کی استنادی حیثیت کو تذکرۃ الرشید کی وجہ سے چیلنج بہر حال نہیں کیا جانا چاہئے راقم السطور احقر کو بات کے اسی پہلو پر اصرار ہے اور احقر بڑی حد تک پر امید بھی ہے کہ احقر کا یہ جذبہ و احساس انشاءاللہ تعالیٰ عنداللہ بھی قابل مواخذہ نہ ہوگا۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کی ابتدا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی مختصر سوانح کے مطابق تو یہ بتائی جا چکی ہے کہ دہلی کے قیام اور طالب علمی ہی کے زمانے میں حضرت امام نانوتوی و حضرت امام گنگوہی حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت بھی ہو گئے تھے اور اسی وقت سے سلوک بھی شروع فرما دیا تھا — لیکن احقر نے زیر نظر مقالہ کی ترتیب کے دوران جب بہ نظر غائر سوانح قاسمی اور اس سلسلہ کی دوسری تحریرات دیکھیں تو احقر راقم اس نتیجہ پر پہنچا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے مجموعی حالات پر غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ بادی النظر میں آپ نے متعدد حضرات اساتذہ کی خدمت میں زانوئے ادب بھی تہ کیا اور اگرچہ آپ نے بظاہر حضرت حاجی صاحب سے بیعت بھی کی اور حضرت کی تلقین کے مطابق ذکر و اشغال و مجاہدہ و ریاضات بھی کئے لیکن ان تمام مصروفیات و مشغولیات کے پس پردہ آپ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

راقم السطور نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تحصیل علم اور آپ کے سلوک طریق کی تفصیلات کو متعدد بار بغور پڑھا تو احقر بھی اسی نتیجہ تک پہنچا ہے جسے مولانا گیلانی صاحب نے سوانح قاسمی میں بار بار دہرایا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی ذات والا صفات اللہ تعالیٰ کی شان اجتبائی کا ایک خاص مظہر تھی، احقر کو صاف دکھائی دے رہا ہے کہ حضرت امام نانوتوی صرف قاسم العلوم ہی نہ تھے بلکہ اپنے سلوک و احسان کے نتیجہ میں ''جامع العلمین'' اور ''مجمع البحرین'' بھی تھے۔

حضرت امام نانوتوی کے علوم و معارف اور منازل و مقامات صرف ان کے کسب و اکتساب ہی کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ان کا بڑا حصہ وہبی و لدنی بھی تھا جو براہ راست من جانب اللہ حضرت والا کے قلب

مبارک پر فائض ووارد ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جن حضرات نے براہ راست حضرت امام قدس سرہ سے استفادہ کیا ہے ان کی شہادت یہی ہے کہ آپ کی تقریر درس میں جو علوم و معارف بیان ہوتے تھے وہ کسی کتاب سے ماخوذ و منقول نہیں ہوتے تھے۔

حضرت امام قدس سرہ کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات کا بیشتر حصہ اگرچہ پردۂ خفا میں ہے کیونکہ آپ کی کتب درسیہ کی خواندگی کا صحیح طور پر پورا تسلسل مختصر سوانح عمری میں بیان نہیں ہوسکا ہے مگر جو کچھ بھی تفصیلات موجود و منقول ہیں انہیں دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ کی درسی کتب کے تسلسل میں جہاں کہیں بھی کچھ خلا محسوس ہوتا ہے اور شبہ ہوتا ہے کہ شاید درمیان کی کوئی درسی کتاب خواندگی سے رہ گئی ہے لیکن مقام حیرت ہے کہ آپ کی علمی صلاحیت واستعداد جس انداز پر سامنے آئی اسے دیکھتے ہوئے صاف دکھائی دیتا ہے کہ درمیان کی کسی درسی کتاب کی ناخواندگی نے حضرت کی تعلیمی استعداد کو کسی طرح بھی تو متاثر نہیں کیا ہے۔

حضرت امام کی ''علمی عبقریت'' کو سمجھنے کے لئے حضرت کی طالب علمی کے دور کی صرف دو مثالیں لائق توجہ وقابل غور ہیں۔

(۱) پہلی مثال تو تعلیم اقلیدس کی ہے کہ عربک کالج دہلی میں جس سال حضرت امام نانوتوی تعلیم کے لئے داخل ہوئے ہیں اسی سال اس کالج کے لئے ایک نیا نصاب تعلیم تجویز ہوا تھا جس میں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم بھی شامل کر لئے گئے تھے۔

نصاب تعلیم کی اس تبدیلی کے نتیجہ میں حضرت امام نانوتوی کو ریاضی اور اقلیدس بھی وہاں پڑھنا تھی مگر پڑھائی کا یہ مرحلہ کس طرح طے ہوا تھا؟ اسی پہلو کا تذکرہ یہاں مقصود ہے، سوانح قدیم میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی فرماتے ہیں:

> والد مرحوم مولانا مملوک العلی نے مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) سے فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو۔ (۲۰)

(۲) دوسری مثال سوانح قاسمی ص ۲۶۳ پر ارواح ثلثہ کے حوالہ سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی مندرجہ ذیل روایت نقل کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

(۲۰) سوانح قاسمی ص: ۲۲۴

علوم عربیہ کے ممتحن مفتی صدرالدین صاحب ہوئے اور مولانا (محمد قاسم) کا ''صدرا'' کا امتحان ان کے پاس گیا، انہوں نے کوئی جگہ پڑھوائی مولانا کے ذہن میں اس کا مطلب نہ تھا کیونکہ وہ جگہ کبھی دیکھی بھالی نہ تھی تو اس پر تقریر کی اور خود جان رہے تھے کہ کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے مفتی صاحب نے اس پر اعتراض کئے تو مولانا نے مفتی صاحب کو ان ہی تقریروں میں الجھا لیا لیکن (دل ہی دل میں) اس پر غور کرتے رہے کہ مطلب کیا ہے، بالآخر اک دم ذہن میں عبارت کا صحیح مطلب آ گیا تو فرمایا کہ مفتی صاحب آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ''یہ بات'' فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ اس بات کا جواب تو یہ ہے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا، مفتی صاحب نے کہا کہ ہاں! یہی تو پوچھتا تھا۔(۲۱)

تعلیمی زندگی کی یہ دونوں ہی مثالیں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ''عبقریت'' اور ''فطری علمی مناسبت'' کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اسی قسم کی متعدد مثالیں حضرت امام نانوتوی کے سوانح وحالات کے درمیان موجود ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے اس لئے ان تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی جارہی ہے۔

حضرت امام نانوتوی کی عبقریت وفطری علمی مناسبت کو دیکھ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور جیسا کہ سوانح قاسمی کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سوال پہلے بھی لوگوں کو پیش آچکا تھا ۔مولانا گیلانی ناقل ہیں:

> حکیم الامت تھانوی قدس سرہ اپنے استاد مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی ہمارے مصنف امام کے حوالہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ان (مولانا محمد یعقوبؒ) سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مولانا (یعنی مولانا محمد قاسم) کو یہ کمالات کس طرح حاصل ہوئے؟ اسی سوال کے جواب میں مولانا محمد یعقوب صاحب نے منجملہ دوسرے اسباب ووجوہ کے یہ بھی فرمایا کہ:
>
> مولانا (محمد قاسم) فطری طور پر معتدل القوئ اور معتدل المزاج تھے۔(۲۲) مولانا گیلانی اس اقتباس کے بعد فرماتے ہیں جیسا کہ معلوم ہے مولانا محمد یعقوب صاحب باضابطہ فن طب کے ماہر

---

(۲۱) ارواح ثلثہ ص:۱۹۶۔ (۲۲) قصص الاکابر ص ۳۰ بابت جمادی الاولی ۵۷ھ

اور استاذ تھے، مولانا مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور رفیق تھے ان کی یہ شہادت کہ فطری طور پر مولانا کے قویٰ اور مزاج دونوں معتدل تھے، میرے نزدیک تو صرف یہی ایک فقرہ حضرت نانوتوی کی جسمانی خصوصیات اور ان غیر معمولی خداداد نعمتوں کے ثبوت کے لئے کافی ہے جن سے آپ نوازے گئے تھے۔ (۲۳)

اس سلسلہ میں اپنی کچھ عرض معروض کرنے سے پہلے حضرت مولانا گیلانی کی سوانح قاسمی ہی کے حوالہ سے حضرت حکیم الامہ تھانوی قدس سرہ کا ایک اور ارشاد جو اوپر مذکور ارشاد ہی کا تتمہ تکملہ ہی کہا جاسکتا ہے وہ بھی عرض کر دینا برمحل ہوگا مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

اسی موقع پر یعنی آپ کے قویٰ اور مزاج کے اعتدال کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی اپنے بعض مذاکروں میں فرمایا کرتے تھے کہ ان کے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب یعنی ہمارے ''مصنف امام'' نے یہ بھی کہا کہ اور حسب سنۃ اللہ اعتدال مزاج سے ''نفس کامل'' فائض ہوتا ہے۔ (۲۴)

حضرت حکیم الامت تھانوی کے حوالہ سے اپنے مصنف امام قدس سرہما کا ارشاد گرامی نقل کرنے کے بعد مولانا گیلانی اس کی مزید تشریح اور تائید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

یہ اس زمانے کے مدرسی فلسفہ یا مشائی علماء کے طریقۂ فکر کی ایک تعبیر ہے، مادے میں جتنی زیادہ بہتر استعداد اور صلاحیت ہوتی ہے، ''واجب اول'' یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے فیضان بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے، اسی مفہوم کو مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کرنے کے لوگ اس زمانے میں عادی تھے، لیکن ایمانی حکمت کی رو سے در حقیقت حضرت نانوتوی کی اجتبائیت (برگزیدۂ حق ہونے) ہی کا ایک معاصرانہ اقرار ہے، ہمارے یہاں جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں مادے میں قابلیت اور استعداد بھی دادِ حق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲۵)

اسی سوانح قاسمی میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے حوالہ سے ایک قصہ لکھا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ:

مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی مصنف امام نے ایک نیا مضمون بیان کیا سننے والوں میں سے

---

(۲۳) سوانح قاسمی ص: ۱۵۴۔ (۲۴) ص: ۲۵ قصص بحوالہ سوانح قاسمی ج ۱ ص: ۱۶۷۔ (۲۵) سوانح قاسمی ص: ۱۶۸

کسی نے کہا کہ اس مضمون کو تو مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی ایک دفعہ بیان کیا تھا، یہ سن کر مصنف امام نے فرمایا:

جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ (مولانا محمد قاسم) بھی فرماتے تھے — جس کا مطلب وہی ہوا کہ سرچشمہ دونوں حضرات کے علوم کا وہی تھا جو تقویٰ کی زندگی سے فطرت میں پھوٹ پڑتا ہے مگر اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

''مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا ہے اور ہمارے لئے سوئی کے ناکے کے برابر کھلتا ہے۔''(۲٦)

حضرت امام نانوتوی کے خداداد علم کی یہ مندرجہ بالا کیفیت سوانح قدیم میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ نے خود حضرت امام کے فرمائے ہوئے الفاظ میں یوں نقل فرمائی ہے فرماتے ہیں:

آمد معانی اور مضامین کی ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضے بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں۔(۲۷)

اسی سلسلہ میں ''ارواح ثلثہ'' میں منقول حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہ کا یہ بیان بھی یہاں نقل کر دینا یقیناً برمحل ہوگا کہ:

چھتہ کی مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے اسی مجمع میں (حضرت مولانا محمد یعقوب) فرمانے لگے کہ بھائی آج تو صبح کی نماز میں ہم مرجاتے بس کچھ ہی کسر رہ گئی لوگ حیرت سے پوچھنے لگے آخر کیا حادثہ پیش آیا؟ سننے کی بات یہی ہے، جواب میں فرما رہے تھے کہ آج صبح میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گزرا کہ میں تحمل نہ کر سکا اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے — کہتے تھے کہ وہ تو خیر گزری کہ وہ دریا جیسا اک دم آیا تھا ویسا ہی نکلا چلا گیا اس لئے میں بچ گیا — آگے یہ بھی ارشاد گرامی منقول ہے کہ نماز کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے، یہ ان کی توجہ کا اثر ہے کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں

(۲٦) ص:۲۹، الہادی جمادی الثانیہ ص:۲۵۷۔ (۲۷) سوانح قدیم ص:۳۵ مشمولہ سوانح قاسمی ص ۳۵

اور تحمل دشوار ہو جائے ـــــ اسی سلسلہ میں حضرت مصنف امام نے حضرت امام نانوتوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اس کے قلب کی وسعت کا کیا حال ہوگا جس میں وہ علوم سمائے ہوئے ہیں اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کیے ہوئے ہوگا۔ (۲۸)

سطور بالا میں حضرت امام نانوتوی کی وسعت قلب اور کثرت علوم کی شہادات حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے حوالہ سے نقل کی گئیں جو حضرت امام نانوتوی کے استاد زادہ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کے شاگرد بھی تھے، اس لئے ممکن ہے کسی کو ان بیانات وشہادات میں سعادت مند شاگرد کی بیجا عقیدت مندی کا خیال گذرے۔ اس خیال سے آئندہ سطور میں حضرت امام نانوتوی کے حقیقی مقام شناس معاصر فقیہ النفس حضرت محدث گنگوہی کا بھی ایک ارشاد نقل کیا جارہا ہے۔

ملفوظات حکیم الامت کے مجموعہ حسن العزیز ص ۳۸۲ کے حوالہ سے معارف الاکابر (ناشر ادارۂ اسلامیات لاہور) کے ''معارف نانوتوی'' کے تحت حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کا ایک ملفوظ نقل کیا گیا ہے جس میں حضرت گنگوہی قدس سرہ نے حضرت امام نانوتوی کو ''شہباز عرش'' فرمایا ہے حکیم الامت نے فرمایا ایک جگہ مولانا محمد قاسم وعظ فرما رہے تھے مولانا گنگوہی بھی شریک تھے ایک بولے کہ خیر وعظ کی مجلس میں بیٹھنے کا ثواب تو ہوگیا، باقی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، اگر مولانا کچھ عام فہم مضامین بیان فرمایا کریں تو کچھ نفع بھی ہو، مولانا گنگوہی سن رہے تھے فرمایا کہ افسوس ہے ''شہباز عرش'' سے درخواست کی جاتی ہے کہ زمین پر اڑے۔

حضرت محدث کبیر مولانا گنگوہی قدس سرہ کا یہ ایک فقرہ جو نہایت بلیغ تشبیہ پر مشتمل ہے حضرت امام نانوتوی کے بلند علمی مقام کو سمجھانے کے لئے بہت کافی ہے، حضرت محدث گنگوہی کے اس ''بلیغ فقرہ'' کی حقیقت حضرت مصنف امام کے بیان فرمائے مندرجہ ذیل واقعہ سے اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے جسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے خود سنا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے

(۲۸) سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۳۴۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ سوال کیا اس وقت حضرت مولانا چھتے کی مسجد کے چھپر والے حجرہ میں تھے اور کوئی خاص کیفیت طاری تھی مولانا نے اس مسئلہ پر تقریر شروع کی لیکن اس تقریر میں لفظ بھی غیر مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس جن کو میں قطعاً نہ سمجھ سکا، میں نے عرض کیا کہ کچھ ''نازل'' ہو کر تقریر فرمایئے میں قطعاً نہیں سمجھا، پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو اس سے کچھ نازل تھی جس کے لفظ مانوس تھے مگر معانی قطعاً بلند اور غیر مانوس جن کو میں نہ سمجھا تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں نہیں سمجھا کچھ اور نازل ہو کر فرمایئے پھر اس سے اتر کر اور نازل تقریر فرمائی جو کچھ قریب الفہم آ گئی تھی مگر پھر بھی نہ سمجھا اور میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا تو فرمایا کہ مولانا پھر کسی وقت پوچھئے گا۔ (۲۹)

گذشتہ صفحات میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی غزارت علم وہبی کی کچھ تفصیلات پیش کردی گئی ہیں اب آئندہ صفحات میں حضرت امام کی طہارت قلب وصفائی باطن پر بھی روشنی ڈالی جائے گی جس سے راقم السطور کا یہ دعویٰ پورے طور پر مبرہن ہو جائے گا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ صرف قاسم العلوم ہی نہ تھے بلکہ جامع العلمین ومجمع البحرین بھی تھے۔

سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی علیہ الرحمہ نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے فطری عالم وسالک ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بار بار حضرت والا قدس سرہ کے لئے ''اجتبائی'' اور ''اجتبائیت'' کا فقرہ استعمال کیا ہے مگر وہ اپنی نکتہ آفرینی کی حد سے آگے بڑھ کر بطور جزم اس کو اپنے اذعانی واعتقادی انداز میں پیش کرتے ہوئے جھجک بھی محسوس کرتے نظر آتے ہیں، موصوف کی اس کیفیت کو راقم السطور نے سوانح قاسمی کے صفحات میں بار بار محسوس کیا اور موصوف کی اس کشمکش کی کیفیت کو دیکھ کر احقر کو اصغر کا یہ شعر یاد آتا رہا:

نہ کامیاب ہوا اور نہ رہ گیا محروم   بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں

راقم السطور حضرت امام قدس سرہ کے حالات وسوانح کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچ سکا ہے وہ بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یوں عرض کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے حضرت امام نانوتوی کُلُّ مولودٍ یُولَدُ علی الفطرۃ کے مکمل اور صحیح مصداق تھے جس کی تائید حضرت مولانا محمد

(۲۹) ارواح ثلثہ ص ۱۹۷، سوانح قاسمی ج ۱ ص: ۴۱۴

یعقوب صاحب نانوتوی کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ:

مولانا (محمد قاسم) فطری طور پر معتدل القوی اور معتدل المزاج تھے ـــــ اور حسب سنت اللہ اعتدال مزاج سے ''نفس کامل'' فائض ہوتا ہے۔

معارف الاکابر میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا یہ ملفوظ مزید تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا:

اس میں کئی چیزوں کو دخل ہے ایک تو مولانا طب کی رو سے معتدل مزاج تھے اس سے اس پر نفس کامل فائض ہوا دوسرے یہ کہ استاد بڑے کامل ملے یعنی مولانا مملوک العلی صاحب جن کا علم وفضل مخفی نہیں تیسرے یہ کہ آپ متقی اعلیٰ درجے کے تھے۔ پھر ان میں استاد کا ادب بہت تھا (اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت امام حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کا بھی نہایت ادب فرماتے تھے صرف اس وجہ سے کہ ان کے بڑے بھائی مولانا مہتاب علی صاحب امام نانوتوی کے استاد تھے اس کے علاوہ یہ وجہ تھی کہ مولانا مملوک العلی صاحب نے اپنی بیماری میں کافیہ کا ایک سبق مولانا ذوالفقار علی صاحب کے ذریعہ پڑھوا دیا تھا پھر پیر بھی بڑے کامل ملے یعنی حضرت حاجی صاحب۔ (۳۰)

اس بنا پر سمجھا جا سکتا ہے کہ تحصیل علوم وفنون اور تحصیل عرفان واحسان کے سلسلہ میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی جو کچھ ''چلت پھرت'' اور ''بھاگ دوڑ'' کے حالات ہمیں حضرت کی سوانح میں ملتے ہیں وہ سب درحقیقت حضرت امام کے ''علم لدنی'' اور ''پیدائشی ولایت'' پر ایک طرح کا پردہ ہیں اور یہ پردے بھی اللہ تعالیٰ نے اس لئے ڈال دیئے ہیں کہ حضرت امام کی سب سے بڑی خواہش دلی یہی تھی کہ وہ گمنام رہیں اور گمنام ہی چلے جائیں:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں　　　می دہد یزداں مرادِ متقیں

پھر حضرت امام نانوتوی کی شخصیت پر پڑے ہوئے پردوں میں بھی صورت یہ ہوئی کہ حضرت امام قدس سرہ کا پردہ علم حضرت کے سلوک وعرفان کے لئے بڑا پردہ بن گیا اور حضرات صوفیہ کے مقولہ ''العلم الحجاب الاکبر'' کا مصداق سامنے آ گیا۔

---

(۳۰) معارف الاکابر ص: ۲۳۲۔

حضرات اہل طریق کی تصریحات کے مطابق اگر غور کیا جائے تو سلوک وتصوف کی بنیاد دو چیزوں پر ہے: اخلاص (واحسان) اور تقویٰ۔

تقویٰ کے مفہوم میں اس درجہ وسعت وگنجائش ہے کہ جملہ اوامر ومندوبات کا امتثال اور جملہ نواہی ومکروہات سے اجتناب، یہ دونوں ہی اس کے مفہوم میں داخل ہیں اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا حضرت امام کا زہد وتقویٰ ہمارے علمائے اکابر دیوبند میں مسلم اور متفق علیہ ہے اور حضرت کی کتب سوانح میں اس کی مثالیں مذکور ہیں۔ چنانچہ معارف الاکابر میں حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کے ملفوظات (۳۱) کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

فرمایا: بزرگوں نے مشتبہ مال سے بچنے کا بڑا اہتمام کیا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی ایک شخص نے دعوت کی، کھانا مشتبہ تھا آپ نے اس کی دلجوئی کے لئے کھا تو لیا مگر گھر پر آکر قے کرکے سب نکال دیا۔

اس سے ایک طالب علمانہ شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ تناول کا ارتکاب تو ہو ہی چکا تھا جو مذموم ہے، پھر ایسا کرنے سے کیا نفع ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ایک فعل تو ہے کھانا وہ تو بے شک واقع ہو چکا مگر دوسری چیز ہے جزو بدن بننا، جزو بدن بننے سے جو ظلمت ہوتی اس سے بچاؤ کیا، جیسا کہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے خبری میں اجرت کہانت کا دودھ پی لیا تھا جس پر کوئی مواخذہ نہ تھا (کہ بے خبری میں کیا تھا) مگر پھر بھی خبر ہونے کے بعد قے کردی، اس کا بھی یہی نفع تھا۔ (۳۲)

حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ کے ملفوظات ہی میں یہ ارشاد بھی ہے:

فرمایا مولانا محمد قاسم صاحب جب مدرسہ دیوبند کے دوات قلم سے کوئی خط لکھتے تھے تو روشنائی اور قلم کے استعمال کے عوض میں ایک پیسہ دے دیتے تھے۔ (۳۳)

حضرت امام نانوتوی کے تقویٰ کی مثال میں وہ مشہور واقعہ بھی اسی موقع پر ذکر کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

خورجہ میں ایک دفعہ کسی نے ایک خوش گلو آدمی کو مجلس مبارک میں لاکر چاہا کہ حافظ کی مشہور غزل

---

(۳۱) الافاضات الیومیہ ج ۲، ص: ۳۰۰۔ (۳۲) معارف الاکابر ص: ۲۴۶۔ (۳۳) الکلام الحسن بحوالہ معارف الاکابر ص: ۲۷۴

— غلام نرگسِ مست تو تاجدارانند — کے مطلع والی سنوائیں حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الاپنا شروع کیا مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہنچی تھی کہ بیچارہ گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا کہ: ''آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے''

(حاشیہ پر یہ تفصیل دی گئی ہے) امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا؟ جواب میں کہا کہ بھائی صاحب گانے میں آگے پڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھ دی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا۔ (۳۴)

چونکہ خواہش بھی یہی تھی۔ کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی تو جن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی نام ان کا عبداللہ خاں تھا۔ گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے، ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں اور چیں بہ جبیں ہو کر فرما رہے ہیں کہ:

میرا ایماء معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی؟ اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ میں جس طرح ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں، اسی طرح ''مولویت'' کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے (ص: ۱۷۶)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بلند مقام تقویٰ سے تعلق رکھنے والے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے راقم السطور کو بڑی شدت سے اس نمایاں تبدیلیٔ احوال کا احساس ہو رہا ہے اور وہ مجبور ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم دو ایک ہی جملے اس تبدیلیٔ احوال سے متعلق بھی قلم بند کر دے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یادگار تذکار منانے کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے حضرت امام کی مکمل حیات کا صحیح نقشہ اپنے اصل خدوخال کے ساتھ آ جائے۔

قابل غور اور لائق عبرت ہے کہ بانیٔ دارالعلوم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ تو حضرت حافظ شیرازی کی ایک غزل کو بھی لہجہ و راگ اور خوش الحانی کے انداز میں سننے کے صرف یہی نہیں کہ روادار نہیں ہوئے بلکہ اس کے لئے اس کرامت کے اظہار پر بھی مجبور ہو گئے جسے عام حالات میں حضرت

---

(۳۴) ارواح ثلثہ ص: ۱۷۶۔

امام چھپانے ہی کا اہتمام فرمایا کرتے تھےاور آج صورت حال اس سے کس درجہ مختلف ہو چکی ہے کہ اب اسی دارالعلوم دیوبند کے فارغین وفاضلین کی خاصی تعداد ٹی، وی جیسی منکر چیز کو اپنے گھروں میں ساتھ رکھتی اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لئے زمین وآسمان اور ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی؟

حضرت امام قدس سرہ کے سلوک کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے راقم السطور عرض کر آیا ہے کہ سلوک کی بنیادی چیزیں دو ہیں۔ سطور بالا میں حضرت کے تقویٰ کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، آئندہ سطور میں حضرت امام قدس سرہ کے اخلاص واحسان کا ذکر کیا جارہا ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ان مکاتیب تک راقم السطور کی رسائی آج (۱۹ر جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۹۹ء) تک نہیں ہوسکی ہے جو حضرت امام نے اپنے مسترشدین کو لکھے ہیں اس لئے حضرت والا کے سلوک واحسان کی ترجمانی کا حق تو ادا کرنا حد درجہ مشکل ہے، امام موصوف کے ایسے گرامی نامے صرف معدودے چند ہی دستیاب ہوئے جن میں سے دو مکتوب مقالہ زیر نظر کے شروع میں نقل کئے جاچکے ہیں، تین مکتوب گرامی یہاں نقل کئے جارہے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) مکتوب گرامی بنام شیخ ضیاء الحق عثمانی (خویش حضرت حاجی رفیع الدین صاحب مہتمم اول دارالعلوم دیوبند)

برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون اینکہ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے، استغفار ولاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو ''عملیات'' میں دخل نہیں، ہاں اس سے پہلے پہلے قرض وکشائش کے لئے حَسْبِیَ اللہ وَنِعْمَ الوکیل اور لاحول ولا قوۃ اِلَّا باللّٰہِ ولا ملجأ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا الیہ پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول وآخر درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل وزبان سے عرض مطلب کررہا ہوں، الراقم محمد قاسم عفی عنہ (۳۵)

(۲) مکتوب گرامی قاسمی بنام مرزا محمد عالم بیگ صاحب

---

(۳۵) مکتوبات اکابر ص: ۵۳۔

— غلام نرگسِ مست تو تاجدارانند — کے مطلع والی سنوائیں حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الا پنا شروع کیا مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہنچی تھی کہ بیچارہ گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا کہ: ''آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے''

(حاشیہ پر یہ تفصیل دی گئی ہے) امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا؟ جواب میں کہا کہ بھائی صاحب گانے میں آگے پڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھ دی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا۔ (۳۴)

چونکہ خواہش بھی یہی تھی۔ کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی تو جن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی نام ان کا عبداللہ خاں تھا۔ گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے، ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرمارہے ہیں اور چیں بہ جبیں ہو کر فرمارہے ہیں کہ:

میرا ایماء معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی؟ اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ میں جس طرح ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں، اسی طرح ''مولویت'' کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے (ص:۱۷۶)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بلند مقام تقویٰ سے تعلق رکھنے والے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے راقم السطور کو بڑی شدت سے اس نمایاں تبدیلیٔ احوال کا احساس ہو رہا ہے اور وہ مجبور ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم دو ایک ہی جملے اس تبدیلیٔ احوال سے متعلق بھی قلم بند کردے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یادگار تذکار منانے کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے حضرت امام کی مکمل حیات کا صحیح نقشہ اپنے اصل خدوخال کے ساتھ آجائے۔

قابل غور اور لائق عبرت ہے کہ بانیٔ دار العلوم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ تو حضرت حافظ شیرازی کی ایک غزل کو بھی لہجہ وراگ اور خوش الحانی کے انداز میں سننے کے صرف یہی نہیں کہ روادار نہیں ہوئے بلکہ اس کے لئے اس کرامت کے اظہار پر بھی مجبور ہو گئے جسے عام حالات میں حضرت

(۳۴) ارواح ثلثہ ص:۱۷۶۔

امام چھپانے ہی کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور آج صورت حال اس سے کس درجہ مختلف ہو چکی ہے کہ اب اسی دارالعلوم دیوبند کے فارغین وفاضلین کی خاصی تعداد ٹی، وی جیسی منکر چیز کو اپنے گھروں میں ساتھ رکھتی اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لئے زمین وآسمان اور ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی؟

حضرت امام قدس سرہ کے سلوک کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے راقم السطور عرض کر آیا ہے کہ سلوک کی بنیادی چیزیں دو ہیں۔ سطور بالا میں حضرت کے تقویٰ کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، آئندہ سطور میں حضرت امام قدس سرہ کے اخلاص واحسان کا ذکر کیا جارہا ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ان مکاتیب تک راقم السطور کی رسائی آج (۱۹؍جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۹۹ء) تک نہیں ہوسکی ہے جو حضرت امام نے اپنے مسترشدین کو لکھے ہیں اس لئے حضرت والا کے سلوک واحسان کی ترجمانی کا حق تو ادا کرنا حد درجہ مشکل ہے، امام موصوف کے ایسے گرامی نامے صرف معدودے چند ہی دستیاب ہوئے جن میں سے دو مکتوب مقالہ زیر نظر کے شروع میں نقل کئے جاچکے ہیں، تین مکتوب گرامی یہاں نقل کئے جارہے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) مکتوب گرامی بنام شیخ ضیاء الحق عثمانی (خویش حضرت حاجی رفیع الدین صاحب مہتمم اول دارالعلوم دیوبند)

برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون اینکہ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے، استغفار ولاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو "عملیات" میں دخل نہیں، ہاں اس سے پہلے پہلے قرض وکشائش کے لئے **حَسْبِیَ اللہ وَنِعْمَ الوکیل** اور **لاحول ولا قوۃ اِلَّا باللّٰہِ ولا ملجأ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا الیہ** پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول وآخر درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل وزبان سے عرض مطلب کر رہا ہوں، الراقم محمد قاسم عفی عنہ (۳۵)

(۲) مکتوب گرامی قاسمی بنام مرزا محمد عالم بیگ صاحب

---

(۳۵) مکتوبات اکابر ص: ۵۳۔

سراپا عنایت سلامت! السلام علیکم آج گیارہویں رمضان کو آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے۔ استغفار اور لاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کی ادائیگی کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو عملیات میں دخل نہیں، اگر ہو سکے تو جناب مولوی اکبر علی خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حال عرض کر دو ادائے قرض کے لئے جو کچھ فرمائیں اس کی تعمیل کرو اور کشائش رزق کے لئے جو کچھ ارشاد فرمائیں اس کو یاد رکھو، ہاں اس سے پہلے **حسبی اللہ و نعم الوکیل** اور **لاحول ولا قوۃ الا باللہ ولا ملجأ ولا منجی من اللہ الا الیہ** پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول و آخر گیارہ بار درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل و زبان دونوں سے عرض مطلب کر رہا ہوں۔

مرزا قادر بیگ صاحب مرزا محمد نبی بیگ صاحب کو یاد رہے تو سلام کہہ دینا اور سوائے ان کے اور کوئی احباب میں مل جائے اور یاد آ جائے تو ان کو بھی، فقط (۳۶) اس مکتوب پر نام و دستخط اور تاریخ تحریر بھی درج نہیں ہے ناقل رومی)

(۳) سراپا عنایت مرزا محمد عالم بیگ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم آج پندرہویں تاریخ (مہینہ مذکور نہیں ہے) جمعہ کو تمہارا خط پہنچا کیفیت حال معلوم ہوئی پچھلے دنوں اثنائے سفر میں بیمار ہو گیا تھا اس مرض سے شفا تو اثنائے راہ ہی میں ہو گئی تھی مگر جب سے کسی نہ کسی قسم کی خلش چلی جاتی ہے، اسی میں کھانسی کی شدت ہو گئی دو تین مہینے اس کی تکلیف رہی اب بفضلہ تعالیٰ اس کو بھی آرام ہے یوں ہی برائے نام باقی ہے انشاء اللہ تعالیٰ وہ بھی رفع ہو جائے گی غرض اب میں اچھا ہوں۔

باقی کی ہوس دنیا کے لئے یادگاری موت سے بہتر کچھ نہیں، ہو سکے تو ہر روز گھڑی آدھ گھڑی موت کے تصور میں گذار دیا کرو اور اس وقت اس قسم کا خیال رکھا کرو کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جس قدر انبیا ہوئے وہ سب مر گئے (وفات پا گئے) جس قدر بادشاہ اس زمانے سے پہلے ہوئے وہ سب مر گئے، بہ زور دین کوئی چھوٹتا تو انبیا چھوٹتے اور بہ زور دنیا کوئی بچتا تو بادشاہ

(۳۶) ماخوذ از مکتوبات قاسمی نسخہ قدیم۔

بچتے میں نہ الی الذی نہ اولا الذینہ زور دینی نہ زور دنیا میں، بچوں تو کیوں کر؟ پھر اس کے ساتھ قیامت کے حساب و کتاب اور عذاب و ثواب کو سوچا کرو فقط (۳۷) (اس مکتوب پر بھی نام و دستخط درج نہیں ہے۔ ناقل رومی)

تعلیقات

حضرت امام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے تین مکتوبات اوپر نقل کئے گئے ہیں جن میں سے پہلے دو مکتوب میں حضرت امام والا مقام نے ہر دو مکتوب الیہ کو ''مراقبہ احسانی'' کی تلقین فرمائی ہے اور تیسرے مکتوب میں ہوس دنیا کی کمی کے لئے ''مراقبہ موت و مراقبہ قیامت'' تجویز فرمایا ہے۔

احقر راقم السطور نے اس قسم کے مکتوبات کی روشنی میں یہ اندازہ کیا ہے کہ حضرت امام نانوتوی کی تعلیم و تربیت کا انداز کتاب وسنت کی تعلیمات ہی پر مبنی تھا حضرات صوفیائے کرام کے مابین مروج وظائف و عملیات کی تعلیم و تلقین حضرت کی تعلیمات میں نہیں ملتیں جو شخص بھی حضرت سے اس قسم کے عملیات دریافت کرتا آپ صاف الفاظ میں اپنی لاعلمی ظاہر فرماتے ہوئے تحریر فرما دیتے کہ کسی عامل سے پوچھئے مجھ کو عملیات میں دخل نہیں۔

حضرت امام گرامی کے ان مکتوبات میں اپنے مسترشدین کو ''مراقبہٴ احسانی'' کی تلقین وتاکید دیکھ کر احقر کو تو کچھ ایسا لگا کہ حضرت امام قدس سرہ نے اپنے زمانہ طالب علمی میں صرف پڑھنے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا تھا بلکہ جو کچھ پڑھا تھا اسے گنا بھی تھا جیسا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے اپنی ملاقات کے تذکرہ میں فرمایا ہے کہ:

> ایک بار از راہ شفقت دریافت فرمایا کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟ حضرت حکیم الامت پر اس قدر رعب وداب غالب ہوا کہ کتابوں کے نام بھول گئے، پھر مولانا (امام نانوتوی) نے دوسری باتیں شروع کیں تاکہ ہیبت کا اثر کم ہو جائے اور حضرت حکیم الامت کی طبیعت کھل جائے — چنانچہ (کچھ دیر بعد) فرمایا کہ:
>
> ایک ہوتا ہے پڑھنا اور ایک ہوتا ہے گننا، محض پڑھنا کافی نہیں، گننے کی ضرورت ہے، پھر ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک حافظ ہدایہ تھے مگر سمجھ کر نہیں پڑھی تھی جنھوں نے سمجھ کر پڑھی تھی کہا کہ ایک مسئلہ

---

(۳۷) ماخوذ از مکتوبات قاسمی قدیم نسخہ۔

ہدایہ میں ہے، حافظ ہدایہ نے انکار کیا کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں نہیں ہے میں ہدایہ کا حافظ ہوں مگر جب دوسروں نے کتاب کھول کر عبارت پڑھ کر استنباط کیا تو حافظ ہدایہ حیران رہ گئے اتنا فرما کر حضرت حکیم الامت سے فرمایا کہ یہ فرق ہے پڑھنے اور گننے میں۔ (۳۸)

حضرت امام کے اس ارشاد کی روشنی میں یہی سمجھا جانا چاہئے کہ امام موصوف نے خود بھی اپنے زمانۂ تعلیم میں محض پڑھنے پر اکتفا نہیں فرمایا تھا بلکہ جو کچھ پڑھا تھا اسے پوری طرح گنا بھی تھا اور شاید اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ حدیث جبرئیل میں آئی ہوئی تشریح ''احسان'' کا مراقبہ حضرت کی تعلیم وتربیت کا بنیادی نقطہ اور مرکزی خیال بن گیا اور اپنے ہر مسترشد کو حضرت امام نے اس کی تلقین وتاکید فرمانا ضروری خیال فرمالیا۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے اصلاحی وتربیتی مکاتیب اگرچہ زیادہ نہیں مل سکے ہیں مگر جو چند خطوط دستیاب ہوئے ہیں انہی کے ذریعہ احقر راقم السطور اس نتیجہ تک پہنچ سکا ہے، احقر کو تو صورت حال کچھ اس طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت امام نانوتوی نے پہلی ہی بار جب حدیث جبرئیل میں ''ماالاحسان'' کا جواب پڑھا ہوگا اسی وقت سے پڑھنے کے دوسرے درجہ ''گننے'' کی بھی تکمیل فرما کر باقاعدہ طور پر عملی مشق بھی شروع فرمادی ہوگی اور پھر نتیجہ یہی ہوا ہوگا کہ یہ ''کیفیت احسانی'' حضرت کا ملکہ راسخہ بن گئی ہوگی۔

سطور بالا میں حدیث جبرئیل میں آئے ہوئے ''ماالاحسان'' کے سوال کا ذکر بار بار آچکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں اس سوال کا جو جواب دیا گیا ہے یعنی **اَنْ تَعْبُدَ اللہ کاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَراہ فَاِنَّہ یَراکَ** (تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ (یہ بات تو بہر حال یقینی ہی ہے کہ) اگر تم اسے نہیں بھی دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں بہر حال دیکھ رہا ہے) حدیث کے اس جواب سے متعلق کچھ ضروری توضیح وتشریح بھی یہاں کردی جائے۔

احقر نے مشکوۃ شریف جب پڑھی تھی تو یاد پڑتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یا تو استاد محترم ہی نے یہ بتایا تھا یا احقر خود کسی غلط فہمی میں حدیث شریف کا یہ مطلب سمجھ بیٹھا تھا کہ اس حدیث میں احسانی مراقبہ کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔

(۳۸) معارف الاکابر ص: ۲۳۹۔

(۱) مراقبہ احسانی کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ عبادت کرنے والا یہ بات دل میں جمالے کہ میں خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر وموجود ہوں اور اسے دیکھ رہا ہوں اس خیال کو دل میں جماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مشاہد ہونے اور منظور الیہ ہونے کا خیال دل میں جمالینا عام حالات میں آسان نہیں ہے اس لئے حدیث شریف کے اگلے فقرے میں مراقبہ احسانی کا دوسرا درجہ بھی بتادیا گیا ہے وہ یہ کہ:

(۲) اگر تم پہلے درجہ کے مطابق خدا تعالیٰ کے حاضر وموجود اور مشاہد ومنظور الیہ ہونے کا خیال دل میں نہیں جما سکتے ہو تو پھر یہ بات ہی دل میں جمالو کہ خدا تعالیٰ جو کہ خبیر وبصیر بھی ہے وہ تو مجھ کو دیکھ ہی رہا ہے، میں اس کے معاینہ ومشاہدہ میں تو بہر حال ہوں اس لئے مجھے یہ عبادت اس طور پر ادا کرنی ہے جس طرح خدا تعالیٰ کے سامنے ہونی چاہئے، میں اگرچہ خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن وہ تو دیکھ ہی رہا ہے۔

حدیث جبریل میں ''احسان'' کی حقیقت اوپر جو بیان ہوئی ہے، مشکوٰۃ شریف پڑھنے کے زمانے (یعنی ۱۳۶۴ھ) میں تو احقر یہی سمجھتا رہا تھا لیکن بعد کو کسی وقت تذکرۃ الرشید حصہ اول میں قرآن وحدیث کے بعض مقامات کی تشریحات جو امام ربانی محدث گنگوہی قدس سرہ سے منقول ہوئی ہیں ان میں اس حدیث احسان کی تشریح یوں منقول ہے جو احقر کے فہم ناقص کے مطابق زیادہ قابل قبول ہے۔(۳۹)

(۸) **تَعْبُدَ رَبَّكَ كَانَّكَ تراه فان لم تَكُن تراه فانه يَراك** کی توضیح میں ارشاد فرمایا کہ فا (**فان لم تكن** کی فا) اس جگہ علت کے لئے ہے پس معنی حدیث یوں ہوئے کہ حق تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو اس لئے کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے (کیونکہ اس کی رویئت دنیا میں غیر ممکن ہے) تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے ''**كانك تراه**'' حرف تشبیہ کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ گویا تم اس کو دیکھتے ہو ''**تراه**'' محض نہیں فرمایا کہ حقیقتاً دیکھ ہی رہے ہو، غرض مقصود حدیث میں جملۂ ثانیہ ''**فان لم تكن الخ**'' سے بھی جملہ اولیٰ ''**كانك تراه**'' کا ثابت کرنا مقصود ہے نہ کہ تردید وتشقیق جیسا کہ عام شراح سمجھ رہے ہیں اگر تقسیم مراد ہوتی تو یوں ارشاد ہوتا: **فان لم تكن في درجة كانك**

(۳۹) ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید مطبوعہ قدیم بلالی اسٹیم ساڈھورہ۔

تراه فانه یراك. فلیفهم (۴۰)

چونکہ شیخین علمائے دیو بند حضرت امام گنگوہی اور حضرت امام نانوتوی قدس سرہما نے کتب حدیث حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے پڑھی تھیں اس لئے بطور ظنِ غالب یہی سمجھا اور کہا جا سکتا ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ بھی حدیث احسان کی تشریح اسی طور پر فرماتے رہے ہوں گے جس طرح اوپر تذکرۃ الرشید سے نقل کی گئی ہے۔

اوپر یہ بات بھی نقل ہو چکی ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ صرف پڑھنے کے قائل نہ تھے بلکہ پڑھنے کے ساتھ گننا بھی ضروری سمجھتے تھے اس لئے حدیث جبرئیل میں جب حضرت امام قدس سرہ کو احسان کی حقیقت دریافت ہوگئی تو پھر حضرت نے اپنی پوری زندگی میں اسے ہر دم اپنے پیش نظر ہی رکھا اور برابر اس کی عملی مشق بھی فرماتے رہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے تین والا نامے جو چند صفحات پہلے نقل کئے جا چکے ہیں ان سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مراقبۂ احسانی حضرت امام کے لئے ملکہ راسخہ بن گیا تھا اور اسی کا یہ اثر تھا جو اوپر کے نقل شدہ مکاتیب مین دیکھا گیا کہ حضرت امام قدس سرہ نے اپنے ہر مکتوب الیہ کو بھی اسی مراقبۂ احسانی کی تلقین فرما کر اسے بھی اپنے ہی رنگ میں رنگنا چاہا ہے۔

مندرجہ بالا مکاتیب میں سے پہلے کے دو مکاتیب میں تو دونوں صاحبان کو مراقبہ احسانی کی تلقین وہدایت فرمائی گئی ہے اور تیسرے گرامی نامہ میں مرزا محمد عالم بیگ کو ہوس دنیا کی کمی کے لئے "مراقبہ موت" و "مراقبہ قیامت" کی ہدایت فرمائی ہے کہ حدیث شریف میں موت کے لئے "ہادم اللذات" (لذتوں کو ڈھا دینے والا) کا لقب تجویز فرمایا گیا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَادِمِ اللَّذَّاتِ "لذتوں کو ڈھا دینے والی چیز (موت) کا ذکر کثرت سے کیا کرو"۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے متعلق جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے حضرت امام کا سلوک صرف قرآن وحدیث ہی کی تعلیمات پر مبنی تھا چنانچہ حضرت امام کے تجویز کردہ دونوں ہی مراقبے (مراقبۂ احسانی اور مراقبۂ موت) حدیث شریف ہی کے تعلیم فرمودہ مراقبے ہیں۔ مراقبۂ احسان تو حدیث جبرئیل میں بتایا ہوا مشہور مراقبہ ہے جسے حضرات مشائخ صوفیہ نے اپنے طریق کی

(۴۰) تذکرۃ الرشید مطبوعہ بلالی اسٹیم ساڈھورہ ج ۱، ص: ۱۰۴۔

بنیاد ہی قرار دیا ہے اور مراقبۂ موت بھی بعض احادیث میں تعلیم فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں امام بیہقی کی شعب الایمان سے بروایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ منقول ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ھذہٖ القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید اذا اصابہ الماء و قیل یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وما جلاؤھا قال کثرۃ ذکر الموت وتلاوۃ القران.(مشکوٰۃ شریف،ص:۱۸۹)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ قلوب انسانی بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب اس پر پانی کا اثر پڑ جائے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ پھر دل کی صفائی (اس کی قلعی) کیسے ہوتی ہے آپ نے فرمایا موت کو بکثرت یاد کرنے سے اور تلاوت قرآن کی کثرت سے قلوب کا تصفیہ ہوتا ہے۔(مشکوٰۃ شریف ص:۱۸۹)

مشکوٰۃ شریف ہی میں انہیں امام بیہقی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت منقول ہے:

قال تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فَمَنْ یُرِدِاللّٰہُ اَنْ یَھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ للاسلامِ. فقال رَسُوْلُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَلنُّوْرُ اِذَا دَخَلَ الصدرَ انْفَسَحَ فقیل یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فھل لِتِلکَ علم یُعرف بہ قال نعم التجافی عن دارِ الغرور والاِنابۃ اِلیٰ دار الخلودِ والاستعداد للموتِ قبلَ نُزُوْلِہٖ.(مشکوٰۃ شریف ص:۴۴۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَمَنْ یُرِدِاللّٰہُ اَنْ یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام (اللہ تعالیٰ جس کے لئے ارادہ فرما لیتے ہیں کہ اسے سیدھی راہ لگا دیں تو اور اس کے سینہ کو (قبول) اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں) تو آپ نے (آیت تلاوت فرمانے کے بعد) فرمایا کہ نور (حق) جب سینے میں داخل ہو جاتا ہے تو سینہ (قبول حق کے لئے) کھل جاتا ہے تو آپ سے پوچھا گیا کہ کیا اس (شرح صدر) کی کوئی پہچان ہے جس سے یہ بات معلوم ہو سکے (کہ شرح صدر ہو گیا ہے)۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں پہچان ہے دنیا سے دوری، آخرت و جنت کی

طرف توجہ اور موت آنے سے پہلے موت کے لئے تیاری (جس کا بہترین طریقہ مراقبۂ موت اور مراقبۂ قیامت ہے)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ نے ایسی ہی احادیث کی روشنی میں مراقبۂ موت و مراقبۂ قیامت کی تعلیم و تلقین اپنے مسترشدین کے لئے تجویز فرمائی ہے۔

مشکوٰۃ شریف کے اسی صفحہ پر اسی حدیث بالا کے ساتھ ایک دوسری حدیث شریف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کا مفہوم تو اس حدیث مذکور سے ضرور مختلف ہے لیکن ہمیں حضرت امام نانوتوی کی زندگی میں اس حدیث شریف کی اثر انگیزی نمایاں طور پر نظر آتی ہے اس لئے اس موقع پر اس حدیث شریف کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا:

عن ابی هريرة وابی خلاد ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اِذَا رَأَيْتُم العَبدَ يُعْطیٰ زهداً فی الدنيا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فاقتربوا منه فانه يُلقیٰ الحکمة. (البیہقی مشکوٰۃ شریف ص:۴۴۶)

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو خلاد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ جب کوئی ایسا بندۂ خدا دیکھو جسے زہد یعنی دنیا سے بے تعلقی و بے رغبتی دی گئی ہو اور وہ کم گو بھی ہو زیادہ نہ بولتا ہو تو اس کے قریب رہا کرو کیونکہ اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکمت و دانائی عطا فرمائی جاتی ہے۔

حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ نے اپنی تصنیف مختصر سوانح عمری حضرت امام نانوتوی میں حضرت امام کی کم سخنی و کم گوئی کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

مولوی صاحب (حضرت امام نانوتوی) کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا اور باوجود خوش مزاجی و ظرافت کے ترش رو مغموم جیسی صورت رکھتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا برا، نہ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے۔ (۴۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی زندگی کو اگر دیکھا جائے تو وہ بیہقی کی مذکورہ بالا روایت ہی

(۴۱) سوانح عمری مرقومہ مصنف امام مشمولہ سوانح قاسمی ج۱، ص:۳۰۔

کے مطابق نظر آئے گی اور اگر حضرت امام کی تصنیفات اور درسی تقریروں کو دیکھا جائے تو حدیث شریف میں آئے ہوئے فقرہ یلقی الحکمۃ کی سچی بولتی ہوئی تصویر دیکھنے کو مل جائے گی باقی رہا حضرت امام نانوتوی کا مقام زہد وانقطاع عن الدنیا تو حضرت کی زندگی کا یہ پہلو اس درجہ مشہور وزباں زدخلائق ہے کہ ضرورت ذکر وبیان ہی نہیں ہے اور مضمون کی مقدار شاید حد سے بڑھی جارہی ہے اس لئے اس کی شہرت عامہ کو نظر میں رکھتے ہوئے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کے دو اہم بنیادی عنصر اخلاص وتقویٰ سے متعلق معروضات گذشتہ صفحات میں مذکور ہوئیں۔

زیر نظر مقالہ کی مجوزہ ذہنی ترتیب کے پیش نظر راقم السطور آئندہ سطور میں مقصد سلوک کی نشاندہی کرنے کے بعد حضرت امام قدس سرہ کی ''منزل رسی'' کا ذکر کر کے اپنا مقالہ ختم کرنا چاہتا ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کے حوالے سے گذشتہ صفحات میں سلوک کے دو اہم بنیادی عنصر اخلاص وتقویٰ کا بیان کیا گیا ہے انہیں حضرات کی تعلیمات کی روشنی میں ''مقصدِ سلوک'' اور ''منزل سالک'' کی بھی تعیین تو ہو ہی جانی چاہئے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے جو حالات وواقعات اور سوانح ہم لوگوں تک پہنچ سکے ہیں انہیں نظر میں رکھتے ہوئے حضرت قدس سرہ کا مقصد سلوک بھی بڑی آسانی سے متعین ہو جاتا ہے اور اسی طرح حضرت کی منزل سلوک کا تعین بھی دشوار نہیں رہ جاتا ہے حضرت امام کے واقعات وحالات بتاتے ہیں کہ حضرت کا مقصد سلوک تو کیفیت احسان کا حصول ہی تھا جو مشائخ طریق کے نزدیک بھی متفقہ طور پر مقصد سلوک ہے جسے اصطلاح سلوک میں حصول نسبت کہتے ہیں۔

چنانچہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ اپنی مشہور تصنیف ''القول الجمیل'' میں فرماتے ہیں:

> مرجع الطرق کلها الی تحصیل هیأة نفسانیة تسمیٰ عندهم بالنسبة لانها انتساب و ارتباط بالله عَزَّ وجَلَّ و (تسمیٰ) بالسکینة وبالنور وحقیقتها کیفیة حَالَّة فی النفس الناطقة من باب التشبیه بالملائکة والتطلع اِلیٰ الجبروت۔(۴۲)

(۴۲) القول الجمیل از نسبت صوفیہ ص: ۴۷۔

حضرات مشائخ کے جملہ طرق کا مرجع ومقصد نفس انسانی کی ایک ہیئت خاصہ کا حاصل کرنا ہے جسے مشائخ کے ہاں ''نسبت'' کا نام دیا جاتا ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کا انتساب وارتباط ہے اور اس نسبت کو سکینہ اور نور بھی کہا جاتا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ نسبت دراصل ایک خاص قسم کی کیفیت ہے جو نفس ناطقہ میں پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نفس میں ایک ملکی شان پیدا ہو جاتی ہے اور عالم بالا کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اس کے علوم مکشوف ہو جاتے ہیں۔

اور رسالۂ شفاء العلیل (ترجمہ القول الجمیل) میں مزید توضیح یوں فرمائی گئی ہے۔

حضور مع اللہ رنگ برنگ ہے جس کسی کو جس قدر تعلق ومحبت اور کسر نفس (فنا) کی توفیق ہوگی اسی قدر اس میں ''ملکہ قویہ'' حاصل ہوگا اور نسبتیں بے شمار ہیں چنانچہ اشغال قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ وغیرہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل ہے اور اس پر دوام ومواظبت اور اس کا استغراق ہے تا کہ نفس میں اس مواظبت اور توجہ دائمی سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جائے۔ (۴۳)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل اقتباس کو بھی پیش نظر رکھنا مفید ہوگا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ القول الجمیل میں فرماتے ہیں:

ولاتظنن ان النسبة لا تحصل الا بهذهِ الاشغال بل هذه طِريق لتحصيلها من غير حصر فيها وغالب الرأى عندى ان الصحابة والتابعين كانوا يحصلون السكينة بطرقٍ اخرىٰ فمنها المواظبة علىٰ الصلواتِ والتسبيحات في الخلوة مع المحافظة علىٰ شريطة الخشوع والحضور ومنها المواظبة علىٰ الطهارة وذكر هادم اللذات وما اعده الله للمطيعين له من الثواب وللعاصين له من العذاب فيحصل انفكاك عن اللذات الحسية وانقلاع عنها ومنها المواظبة علىٰ تلاوة الكتاب والتدبر فيه واستماع كلام المواعظ وما في الحديث من الرقاق۔ (۴۴)

آپ یہ گمان نہ کریں کہ یہ نسبت ان اشغال کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں ہوتی ہے ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اشغال بھی منجملہ طرق دیگر ایک طریقۂ تحصیل نسبت ہے، میرا غالب گمان

(۴۳) نسبت صوفیہ ص: ۴۷۔ (۴۴) نسبت صوفیہ ص: ۴۸۔

تو یہ ہے کہ حضرات صحابہ وتابعین یہ ''نسبت وسکینت'' دوسرے ہی طریقوں سے حاصل کرتے تھے۔ من جملہ ان کے نماز پنجگانہ کی پابندی اور خلوت میں تسبیحات وغیرہ کا اہتمام اور خشوع وحضور کی شرط لازمی بھی ان میں ملحوظ رہتی تھی اور منجملہ ان کے ہر وقت باطہارت رہنے کی پابندی اور ذکر موت کا اہتمام اور یہ مراقبہ کہ آخرت میں اطاعت گذار بندوں کو کیا کیا اجر وثواب ملے گا اور نافرمانوں کو کیسے کیسے عذاب دیئے جائیں گے اس مراقبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیاوی اور حسی لذتوں سے طبیعت کو دوری ہو جائے گی اور یہ لذتیں سب چھوٹ جائیں گی اور من جملہ ان کے تلاوت قرآن اور اس میں غور وفکر اور خوف ورقاق کی احادیث کا سننا بھی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر (جبکہ مقصد سلوک کی تعیین کی جارہی ہے) حضرت محدث گنگوہی قدس سرہ کی ایک تحریر کا مختصر ضروری اقتباس بھی نقل کر دیا جائے فرماتے ہیں:

ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر وموجود جان کر حیاء وشرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا، مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے، باقی زوائد

اسی سلسلہ میں آگے چل کر (حضرات صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا سلوک بیان کرتے ہوئے) فرماتے ہیں:

سنو! کہ سلوک صحابہ وتابعین وتبع تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجوہ محتاج ذات غنی کا اور حضور اس کردگار بے نیاز محسنِ عباد کا ہونا تھا، بندگی دربندگی، عجز درعجز، توکل درتوکل... ہمت اطاعت وجان ومال کی بازی فی رضاء المولیٰ اس کا ثمرہ تھا، نہ استغراق تھا نہ فنا تھی... متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے ربط حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہو جائے سو بعد مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے اخس تک اپنے خالق سے مربوط اور اس کے وجود سے موجود ہیں بوحدت وجود یا بوحدت شہود علیٰ خلاف بینہم.

پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا اور انتہا راہ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے پس جذب کے معنی رجوع السالک الیٰ حقیقۃ الحقائق واصل الاشیاء اور اس میں فنا اپنا اور اپنے علم انانیت کا کر دینا مقرر ہوئے۔

اس راہ جذب کو جو حضرات مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے گویا وہ کمالات

اب کالعنقا ہو گئے جس طرح کوئی سالک مجاہدہ کر کے کوئی مقام طے کرے، ہنوز اس کے آثار کے سوا ان کمالات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، ان کا حوصلہ وملکہ ملاء اعلیٰ سے ناشی تھا، اب ملاء اسفل سے بھی پوری مناسبت نہیں... مع ہذا راہ جذب ہے نہ درگاہ (راقم السطور رومی کے فہم ناقص میں اس خط کشیدہ فقرے میں بوقت کتابت کچھ تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے فقرہ شاید یوں ہوگا "مع ہذا جذب راہ ہے نہ درگاہ" (یعنی جذب طریق وذریعہ ہے مقصود ومنزل نہیں ہے) بعد طے راہ جذب کے وہی طریقۂ صحابہ کہ "عبدیت" کا مقام ہے اختیار کرنا وعبادت وعاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے۔(۴۵)

مکتوبات رشیدی کے مندرجہ بالا اقتباس پر مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ مزید توضیح فرماتے ہیں:

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے صحابہ کے سلوک کی جو تفصیل بیان فرمائی ہے بہت خوب ہے اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے بلاشبہ حضرات صحابہ کا یہی حال تھا لیکن حضرت نے یہ جو فرمایا کہ وہاں نہ استغراق نہ فنا تھی تو اس کی کچھ توضیح کرتا ہوں وہ یہ کہ یہ صحیح ہے کہ جس نوع کا استغراق اور فنا متاخرین کو حاصل تھا حضرات صحابہ کا فنا اس قسم کا نہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں وہ حضرات فنا سے عاری تھے، ایسا نہیں تھا ان حضرات نے تو اپنے آپ کو کامل طور پر فنا کر دیا تھا لیکن ان کے فنا میں سکر نہ تھا کہ بالکل ہی مغلوب الحال اور مستغرق ہو جاتے بلکہ ان کا فنا صحو کے ساتھ ساتھ تھا پورے فانی اور پوری طرح باہوش تھے... اور بعد کے لوگوں میں یہ جامعیت نہ تھی بلکہ ان کے فنا میں سکر کا انداز تھا۔(۴۶)

سطور بالا میں اصلاً بیان تو مقصد سلوک کا ہو رہا تھا لیکن مکتوبات رشیدی میں سلسلۂ کلام مقصود سلوک اور منزل سالک تک پہنچ گیا اس لئے آئندہ چند سطور میں مقصود سلوک ومنزل سالک ہی سے متعلق معروضات پیش کی جا رہی ہیں۔

حضرات مشائخ طریق وسلوک کی تصریحات سے منزلِ سالک اور مقصود سلوک بھی متعین ہو جاتا ہے کہ مقصود سلوک فنائے انانیت ہے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے

---

(۴۵) مکتوبات رشیدیہ ص:۲۰ بحوالۂ نسبت صوفیہ ص:۵۳۔(۴۶) نسبت صوفیہ ص:۵۴

صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس فنا پر گفتگو فرمائی ہے اس مکتوب کی چند سطریں یہاں نقل کی جارہی ہیں فرماتے ہیں:

این بزرگواراں (مشائخ صوفیہ) درمحبت حق جل وعلا از خود واز غیر خود گسستہ اند و در عشق او از آفاق وانفس گزشتہ ماسوا را در راہ او در باختہ و باد ساختہ اند، اگر حاصل دارند اورا دارند اگر واصل اند باو واصل اند، باطن شاں را بہ نہج انقطاع از دون او تعالیٰ روے دادہ است کہ اگر سالہا یاد ماسوا نمایند بیاد شان نیاید واز انانیت نفس بہ نوعے گذشتہ اند کہ عود کلمہ انا را بر خود شرک می دارند. (۴۷)

ان بزرگوں نے حضرت حق جل وعلا کی محبت میں خود اپنے آپ سے بھی اور اپنے غیر سے بھی رشتہ وتعلق قطع کرلیا ہے اور اس کے عشق میں انفس وآفاق سے گزر کر ہر ماسوا کو اس کی راہ میں بازی پر لگا دیا ہے اب اگر کچھ ان کو حاصل ہوا ہے تو وہ حق تعالیٰ ہی ہوا ہے اور اگر وہ کسی تک واصل ہوئے ہیں تو اسی حق تعالیٰ تک واصل ہوئے ہیں، ان کا باطن حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے اس طرح بے تعلق ہوگیا ہے کہ اب اگر وہ سالہا سال تک ماسوا اللہ کو یاد کرنا بھی چاہیں تو وہ انہیں یاد نہ آئے اور اسی طرح اپنی "انانیت" سے اس طرح نکل گئے ہیں کہ اب انہیں اپنی ذات کے لئے کلمہ "انا" کا استعمال کرنا بھی شرک معلوم ہوتا ہے۔

اسی مکتوبات معصومیہ میں ایک موقع پر اس غلط فہمی کا بھی ازالہ فرمایا گیا ہے جو آج کل کے بہت سے سالکین بلکہ بعض مشائخ طریقت کی زندگی میں نمایاں طور پر دیکھی جاتی ہے فرماتے ہیں:

مقصود از سیر وسلوک شیخی ومرید گرفتن نیست مقصود ازاں ادائے وظائف بندگی است بے منازعت نفس۔ ونیز مقصود نیستی وگمنامی است و زوال رعونت وانانیت امارہ کہ معرفت بداں مربوط است (۴۸)

سیر وسلوک سے یہ مقصود نہیں ہے کہ سالک شیخ بن جائے اور لوگوں کو مرید بنانے لگے بلکہ اس سے مقصود ہے کہ سالک منازعتِ نفس (کشمکش نفس) کے بغیر آسانی کے ساتھ وظیفہ بندگی وعبودیت ادا کرنے لگے اور اس سے مقصود نیستی وگمنامی بھی ہے کہ دل سے رعونت وتکبر اور "نفس امارہ کی انانیت" نکل جائے کہ حق تعالیٰ کی معرفت اور حصولِ نسبت اسی فنا ونیستی سے وابستہ ہے (۴۹)

(۴۷) مکتوبات معصومیہ ص ۴۸ ج ۳۔ (۴۸) مکتوبات معصومیہ ص: ۶۸ بحوالہ نسبت صوفیہ ص: ۵۹ (۴۹) مکتوبات معصومیہ بحوالہ نسبت صوفیہ

اسی گمنامی ونیستی کے لئے کسی شاعر کا یہ شعر بھی خوب ہے:

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے   کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

مگر سلوک وطریقت کے لحاظ سے شعر محلِ غور ہے کیونکہ کچھ مرتبہ چاہنا گمنامی ونیستی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا سوانح قاسمی میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے متعلق حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ:

فانی وہ ہے جسے یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں فانی ہوں

راقم سطور اس کی مزید توضیح کر دینا چاہتا ہے مطلب یہ ہے کہ فنا کی حقیقت ہے، کچھ نہ ہونا اور کچھ کے عموم میں احساس فنا بھی ہے لہٰذا یہ احساسِ فنا بھی نہ ہونا چاہئے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے فنا ونیستی کی شہادت حضرت امام کے حقیقی مرتبہ شناس محدث گنگوہی علیہ الرحمہ نے ان الفاظ میں ادا کی ہے کہ:

جس شخص کے قلب میں ایمان کی طرح یہ راسخ ہو چکا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل وخوار کوئی ہستی نہیں ہے۔(۵۰)

اس درجہ کے معتمد وثقہ ائمۂ سلوک وطریق دو بزرگوں کی ایسی وقیع شہادت کے بعد کوئی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے کامل السلوک ہونے کا کوئی اور ثبوت پیش کیا جائے لیکن ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی زندگی میں اس گمنامی ونیستی اور فنا کی جو جھلکیاں درخشاں ہیں مختصر طور پر کچھ ان کا بھی تذکرہ ہو جائے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے یہ عام شہرت ہے کہ حضرت امام لوگوں کو آسانی سے بیعت نہیں فرماتے تھے مکتوبات معصومیہ کا ایک اقتباس ابھی اوپر نقل ہوا ہے جس میں خواجہ معصوم نے بہت صاف الفاظ میں بات کہہ دی ہے کہ سلوک کا یہ مقصود ہی نہیں ہے کہ سالک شیخ بن کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو مرید بنانا شروع کر دے اس لئے حضرت امام نانوتوی (جن کی پوری زندگی اخفاوتستر اور گمنامی وفنا کی کوششوں ہی میں گذری ہے) اس غیر مقصود مقام کو آسانی سے قبول فرما سکتے تھے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے ثقہ راویوں کے تواتر کے ساتھ اس قسم کے متعدد فقرے

---

(۵۰) سوانح قاسمی ج ا، ص: ۴۸۳۔

منقول ہیں جو حضرت کے "مقام فنا" کا پتہ دیتے ہیں:

(۱) ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔ (۵۱)

حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ منقولہ بالا کلمات نقل فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

(۲) میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے؟ کیا اس میں سے ظاہر ہوئے آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا اور اپنا کہنا کر دکھایا (حوالہ بالا)

(۳) لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔ (۵۲)

(۴) اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کا بھی گھونسلہ ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا۔ (ارواح ثلثہ ص:۱۷۲ الخ قاسمی ص:۲۴۵)

سوانح قاسمی میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے تلمیذ خاص مولانا عبدالعلی سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام نے انہیں حکم دیا کہ:

(۵) مجھے اس خلجان سے جس میں (مخلوق کی آمد و رفت کی وجہ سے) مبتلا ہو گیا ہوں نکالو... میری عقیدت لوگوں کے دلوں سے نکالو۔

(۶) اگر میں یہ جانتا کہ پڑھ لکھ کر یہ دقتیں پیش آئیں گی (یعنی لوگ میرا پیچھا کریں گے تو) میں نہ لکھتا نہ پڑھتا صرف سیدھی سادی نماز روزے کے مسائل سیکھ لیتا۔ (۵۳)

اب آیئے اسی طرح حضرت امام نانوتوی کا مقام فنا حضرت امام کی عملی زندگی میں بھی دیکھئے:

(۱) یہ بات اس درجہ مشہور ہے کہ یہاں بغیر کسی حوالہ کے اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ حضرت امام

---

(۵۱) سوانح عمری قدیم مشمولہ سوانح قاسمی ص:۳۱۔ (۵۲) قصص الاکابر ص:۱۳۰ سوانح قاسمی ص:۲۴۹۔ (۵۳) سوانح مخطوطہ ص:۳۸، سوانح قاسمی ص:۴۸۵

نانوتوی اخفائے حال کے لئے خود اپنے اسم گرامی اور اپنے وطن مالوف کا نام بتانے میں اخفا سے کام لے لیا کرتے تھے چنانچہ اپنے اصل نام کی جگہ تاریخی نام خورشید حسین بتا دیتے اور اپنے وطن کا نام الہ آباد بتا دیتے (کہ ہر مقام تو اللہ تعالیٰ ہی کا آباد کیا ہوا ہے اسے الہ آباد بھی کہا جا سکتا ہے)

(۲) بعض موقعوں پر اپنے ''تصرف باطن'' کا بھی اخفا فرمایا ہے اس ذیل میں دو تین واقعات قابل ذکر ہیں:

(الف) معارف الاکابر میں حضرت حکیم الامۃ تھانوی علیہ الرحمہ کے مجموعہ ملفوظات ''خیر الافادات'' کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے:

فرمایا: ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کسی مسجد میں چند مریدوں کو توجہ دے رہے تھے اور رات کا وقت تھا چراغ نہ تھا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کی خبر لگی جلدی سے آکر خفیہ طور پر حلقہ میں بیٹھ گئے حضرت نانوتوی کو ''نسبت یعقوبیہ'' کا احساس ہو گیا آپ نے توجہ روک لی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کا ادراک ہو گیا، خفا ہو کر فرمانے لگے: بنادوان کو وہ غوث وقطب، میں ہی ایک منحوس ہوں جو خار معلوم ہوتا ہے۔ (۵۴)

(ب) خورجہ میں ایک صاحب حاجی محمد اسحٰق نامی تھے، بیچارے ذاکر وشاغل اور پابند صوم وصلوٰۃ سیدھے سادے مسلمان تھے، خود حاجی صاحب مرحوم امیر شاہ خاں صاحب سے کہتے تھے کہ ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں جب کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے، جب بیلوں کو سانٹا مارا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لگتا ہے، جب کتوں میں لڑائی ہوتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے کو کاٹتے ہیں جب چکی چلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ گیہوں کے بدلہ میں ہی پس رہا ہوں، لڑکے بھاگتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑ رہے ہیں... آخر میں کہتے تھے کہ میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا اور نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں، حالت یہ ہو گئی تھی کہ مسجد آنا جانا بھی ان کے لئے دشوار ہو گیا تھا کان میں روئی کے روہڑ ٹھونس کر گھر ہی میں پڑے رہتے تھے۔

امیر شاہ خاں صاحب کے حاجی اسحٰق دوست بھی تھے سیدنا الامام الکبیر سے بیعت کا شرف

(۵۴) معارف الاکابر ص ۲۷۵۔

بھی ان کو حاصل تھا، ان کا حال سن کر خاں صاحب نے فرمایا کہ مناسب ہے کہ اپنے پیرومرشد (مولانا نانوتوی) کو اپنے حال سے آگاہ کرو، جو حالات گزر رہے تھے لکھ کر امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ حاجی صاحب نے کئے انہوں نے اپنے سفارشی خط کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں بھیج دیئے، اسی زمانے میں حضرت کا قیام دلی ہی میں تھا جواب میں امیر شاہ خاں صاحب کو حضرت کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ حاجی اسحٰق کو میرے پاس یہیں (دہلی) بھیج دو حسب الحکم حاضر ہوئے پھر جیسا کہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ:

> مولانا نانوتوی نے کچھ نہیں کیا صرف اوراد واشغال کے وقت بدل دیئے اور وقت کی صرف اس ہلکی سی تبدیلی کا نتیجہ یہ دیکھا گیا کہ حاجی اسحٰق مرحوم دوسرے ہی دن اچھے ہو گئے۔

جو کچھ کیا گیا اس کو دیکھ کر بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اوقات کی تبدیلی ازالۂ مرض کا سبب بن گئی، لیکن جس قسم کی بیماری میں حاجی صاحب مرحوم مبتلا تھے کیا اس سے صحت یاب ہونے کے لئے اوراد واشغال کے اوقات کا بدل جانا کافی تھا؟ اس راہ کے ایک محرم اسرار سے سنئے!

حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ:

> احقر کا وجدان ہے کہ مولانا (نانوتوی) نے تصرف فرمایا ہے اور اخفاء تصرف کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات بدلے ہیں۔ (۵۵)

حضرت امام نانوتوی کے مقام فنا کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت امام قدس سرہ کے مفصل حالات وسوانح نہ ہونے کے باوجود متعدد واقعات مختلف صورتوں سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

اسی طرح حضرت امام قدس سرہ کی متعدد کرامات بھی مختلف تذکروں میں موجود ہیں لیکن چونکہ کرامات کا ہونا مشائخ طریق کے نزدیک معیار بزرگی نہیں سمجھا گیا ہے اس لئے ان کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل کمال حضرت امام نانوتوی کا ان کا یہی ''مقام فنا'' تھا کہ بہت کچھ ہوتے ہوئے بلکہ سب کچھ ہوتے ہوئے حضرت کی پوری کوشش یہی رہی کہ انہیں کچھ نہ سمجھا جائے، اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جسے حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نے ذکر فرمایا ہے

---

(۵۵) ارواح ثلثہ ص: ۱۶۹، سوانح قاسمی: ۳۳۴۔

ملاحظہ ہو قدیم سوانح عمری کا صفحہ ۳۶ فرماتے ہیں: (۵۶)

ایک بار مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب وغریب بیان ہوتے، ایک صاحب کہ کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے سن کر یوں سمجھے کہ یہ (عجیب وغریب مضامین) اثر تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ مولانا کو فیض باطنی دیا جائے، درخواست کی کبھی تنہا ملئے، آپ نے فرمایا کہ مجھے کار چھاپہ خانہ کا اور پڑھانا طلبہ کا رہتا ہے تنہائی کہاں؟ آپ جب چاہیں تشریف لائیں وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ آپ ذرا میری جانب متوجہ ہوں اور خود آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے مولانا (محمد قاسم صاحب) سبق پڑھا رہے تھے البتہ موقوف کر دیا مگر آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بند ان کی طرف متوجہ ہوئے ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے کچھ دیر یہ معاملہ رہا پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے پھر معذرت کی اور کہنے لگے مولانا مجھے خبر نہ تھی کہ آپ میں یہ جوہر بھی علی الوجہ الاتم موجود ہے۔ (۵۷)

راقم السطور کا گمان ہے فیض باطنی پہنچانے والے بزرگ کا یہ قصہ زمانۂ قیام میرٹھ میں اس وقت پیش آیا ہوگا جب حضرت امام نانوتوی سے ایک جماعت مسلم شریف پڑھ رہی تھی (دار العلوم دیوبند کا قیام اس وقت تک نہیں ہوا تھا) مسلم شریف کی جماعت میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھی شریک تھے، اسی وجہ سے حکایت واقعہ ایسے انداز سے تحریر فرمائی ہے جیسے یہ واقعہ عینی مشاہدہ ہو۔

اسی نوعیت کا یہ دوسرا واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو سوانح قاسمی میں ارواح ثلثہ سے نقل کیا گیا ہے جس کے راوی مشہور صاحب روایات حضرت امیر شاہ خاں صاحب ہیں کہ:

نواب مصطفیٰ خاں کی یہ عادت تھی کہ ہمارے اکابر (خانوادہ ولی اللّٰہی) میں سے جب کوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فوراً مراقب ہو کر ان کی نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت نانوتوی ان سے ملنے تشریف لے گئے اور نواب صاحب حسب عادت مراقب ہوئے، سر اٹھایا تو ایک صاحب امو جان (نامی) سے خطاب فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے لیکن

---

(۵۶) سوانح قاسمی میں بھی یہ واقعہ ص: ۳۲۸ پر مذکور ہے نقل روایت میں کچھ حصہ اس کا بھی آگیا ہے۔

(۵۷) ارواح ثلثہ ص: ۱۹۵، سوانح قاسمی ص: ۳۲۸۔

مولانا کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ (۵۸)

ارواح ثلثہ میں یہ حکایت اسی قدر بیان ہوئی ہے پڑھ کر تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اصل صورت حال کیا تھی؟ احقر اپنے فہم ناقص سے یہ سمجھ سکا ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ نے نواب صاحب کو امتحان لینے کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنی نسبت کا پوری طرح اخفا فرمالیا کہ انہیں نسبت کا پتہ ہی نہ لگ سکا مذکورہ بالا دو واقعات میں دو مختلف بزرگوں نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے نہ صرف صاحبِ نسبت ہونے کی بلکہ صاحب نسبت قویہ ہونے کی شہادت دی ہے، اس کے بعد اب خود حضرت امام کے شیخ طریقت اور پیر مرشد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی نہ صرف شہادت بلکہ ''سندِ اعزاز'' قابلِ توجہ اور لائق دید ہے۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے اپنے رسالہ ضیاء القلوب میں ان حضرات شیخین کے لئے یہ سند اعزاز مرحمت فرمائی ہے اصل عبارت فارسی کا ترجمہ ملاحظہ فرمایا جائے، حضرت حاجی صاحب نے اس سند اعزاز کو مبنی بر الہام فرمایا ہے:

> جو شخص اس فقیر (حاجی امداد اللہ صاحب) سے محبت، عقیدت، اور ارادت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ مولوی محمد قاسم اور مولوی رشید احمد صاحب جو کہ تمام ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں، میری طرح بلکہ مجھ سے بڑھ کر شمار کرے، اگرچہ معاملہ برعکس ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہوں، ان کی صحبت کو غنیمت سمجھئے کیونکہ ان جیسے آدمی اس زمانے میں نایاب ہیں۔
>
> آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حق تعالیٰ دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لائے؟ تو میں قاسم اور رشید کو پیش کر دوں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (۵۹)
>
> حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مختصر سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب کو فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے...اب اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ مولوی (محمد قاسم) صاحب کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو۔ (۶۰)

یہ تمام تفصیلات جان لینے کے بعد ناظرین کرام کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہو گا کہ زیر

---

(۵۸) ارواح ثلثہ ص: ۲۷۷، سوانح قاسمی ص: ۳۲۷۔ (۵۹) معارف الاکابر ص ۲۳۵۔ (۶۰) مختصر سوانح مشمولہ سوانح قاسمی ص: ۳۴۔

نظر مضمون میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے احسان وسلوک کے تحت بہت کچھ باتیں تو بیان ہوگئیں لیکن حضرت امام کے مجاہدات وریاضات کا مطلق ذکر نہیں آیا؟ کیا حضرت والا کو ان مراحل سے گزرنا نہیں پڑا تھا؟ جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی زبانی سنئے جو حضرت امام والا مقام کے زمانۂ بیعت اور زمانۂ ابتدائے سلوک میں حضرت امام کے ساتھ دہلی ہی میں قیام فرما تھے مختصر سوانح قاسمی کے چند متفرق اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(الف) مولوی صاحب نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا، اشغال دشوار جیسے ''حبس دم'' اور ''سہ پایہ'' مدت تک کئے ہیں اور ''بارہ تسبیح'' اور ''ذکر ارّہ'' کا دوام تھا ہی سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے، حرارت مزاج میں ایسی آ گئی تھی کہ کسی صورت سے فرو نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ حرارت قلب کی تھی اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوئی، یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) (ص:۲۹)

(ب) مولوی صاحب بھی میرے پاس آ رہے، کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے، روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے، میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھاویں سالن دے دیا کرو مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر لے لیتے تھے ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے۔ (۶۱)

حضرت امام کے مجاہدہ وریاضت کی مزید تفصیل سوانح مخطوطہ میں یوں بیان کی گئی ہے:

مگر بایں ہمہ شان عبودیت آپ (مولانا نانوتوی) پر ایسی غالب تھی کہ آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم ذکر ارّہ وغیرہ میں مشغول رہے، چھ چھ سات سات گھنٹے ذکر ارّہ اور حبس دم کرتے تھے۔ جس وقت آپ اس شغل کو کرتے صرف ایک تہ بند بدن پر رکھتے تھے — وہ تہ بند عرق بدن (پسینے) سے ایسا تر ہو جاتا کہ بعد الفراغ اس کو بدن سے علیحدہ کر کے اور نچوڑ کر خشک کرتے تھے۔ (۶۲)

اب اسی موضوع سے متعلق سوانح قاسمی ص ۳۰۴ تا ۳۰۶ کا ایک طویل اقتباس قدرے اختصار کے ساتھ ملاحظہ ہو اس اقتباس میں متن یعقوبی اور شرح گیلانی دونوں ہی کی عبارات نقل ہوں گی۔

---

(۶۱) سوانح قاسمی ص:۲۹۔ (۶۲) سوانح مخطوطہ ص:۱۵) سوانح قاسمی ص:۳۰۳

''متن یعقوبی'' جب احقر اجمیر گیا مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب) اسی مکان (کوچہ چیلان والے) میں رہتے تھے اور دو ایک آدمی اور تھے، اتفاق سے سب متفرق ہو گئے اور مولوی (محمد قاسم) صاحب تنہا رہ گئے، مکان مقفل رہتا تھا (ص:۲۹،۳۰)

''شرح گیلانی'' بظاہر دن کو بھی مقفل رہتا تھا اور رات کو بھی مقفل ہی رہتا تھا مگر باہر سے جو مکان دیکھنے والوں کو مقفل نظر آتا تھا دن کو تو نہیں لیکن جب دن ختم ہو جاتا اور رات اپنی تاریکی کے پردے میں دنیا کو چھپا لیتی تھی اسی وقت جیسا کہ مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

(متن یعقوبی) رات کو مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے (ص:۳۰)

''شرح گیلانی'' شاید اسی لئے کیا جاتا تھا کہ آنے (جانے) والے راہ گیروں پر بھی اثر قائم رہے کہ کوئی اس مکان میں نہیں رہتا ہے اور تنہائی میں خلل انداز نہ ہو اور اسی کواڑ چڑھائے ہوئے مقفل مکان میں تن تنہا ساری رات گزرتی تھی یا گزاری جاتی تھی پھر بقول مصنف امام ''متن یعقوبی'' اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے چند ماہ اسی ''ہو'' کے مکان میں گذرے (ص:۳۰)

''شرح گیلانی'' شاید ''ہو'' کے اسی مکان کا وہ مشہور واقعہ ہے جس کا ذکر خاکسار (مولانا گیلانی) سے براہ راست حضرت مولانا حبیب الرحمان العثمانی سابق مہتمم دارالعلوم بھی فرمایا کرتے تھے۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ:

حضرت نانوتوی اپنے بند حجرے میں ذکر میں مشغول تھے تو ہر ضرب کے ساتھ دھماکے کی آواز بھی آتی تھی لوگ مشوش ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے حجرے کے کواڑ اتارے گئے کیونکہ اندر سے زنجیر بند تھی، اندر جا کے دیکھا تو حضرت کے برابر ایک سانپ ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی اپنا سر زمین پر دے مارتا ہے، حضرت گردن اٹھاتے ہیں تو وہ بھی سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی زور سے زمین پر سر پٹکتا ہے، یہ دھماکہ اسی کا تھا لوگوں نے اسے مارا، مار کر باہر لائے لیکن حضرت کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ (۶۳)

---

(۶۳) مکتوب الحفید السعید ۳؍ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) (سوانح قاسمی ص:۳۰۶۔

راقم السطور کے فہم ناقص میں تو گنجائش اس بات کی بھی ہے کہ وہ سانپ اسی ویران وغیر معمور مکان کا مکین کوئی جن ہی رہا ہو اور حضرت امام قدس سرہ اس کی موجودگی اور اپنے برابر ہی بیٹھے ہوئے ذکر میں شرکت سے باخبر بھی رہے ہوں اور اس کے بے ضرر ہونے کی وجہ سے اس سے تعرض غیر ضروری خیال فرماتے رہے ہوں لیکن یہ اجانب جو اصل صورت حال سے بالکل بے خبر تھے اسے ضرر رساں وموذی سمجھ کر مار ڈالنا ہی ضروری سمجھا ہو اور حضرت نے بھی اخفائے حال واخفائے بزرگی کے پیش نظر اپنے کو بالکل ہی بے خبر ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا ہو۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

حضرت امام نانوتوی کی ایک اور خصوصیت

گزشتہ صفحات میں حضرت امام قدس سرہ کے شیخ وپیر مرد کی سند اعزاز کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اس سند اعزاز میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ بھی ان کے شریک ہیں۔

اب حضرت امام نانوتوی کی ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک وسہیم نہیں ہے حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ اپنے اور حضرت امام نانوتوی کے شیخ ومرشد حضرت امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اصطلاحی عالم نہیں ہوتے ایک لسان عطا فرماتے ہیں چنانچہ حضرت شمس تبریزی کو مولانا رومی لسان عطا ہوئے جنہوں نے حضرت شمس تبریزی کے علوم کو کھول کھول کر بیان فرمادیا اسی طرح مجھ (حضرت حاجی صاحب) کو مولوی محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں (حضرت حکیم الامت یہ بھی فرماتے تھے کہ)

> مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب میں اپنی تصنیف کو حضرت حاجی صاحب کو سنا دیتا ہوں تب مجھے اس کے مضامین پر اطمینان ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے بدون سنائے اطمینان نہیں ہوتا اور ایک بڑی لطیف بات فرماتے تھے کہ ہمارے ذہن میں مبادی پہلے آتے ہیں یعنی مقدمات اول آتے ہیں ان کے تابع نتیجہ ہوتا ہے اور ان حضرات کے ذہن میں نتائج پہلے آجاتے ہیں اس لئے جب سنا لیتا ہوں تو اطمینان ہو جاتا ہے کہ مقاصد تو ٹھیک ہیں، مقدمات چاہے غلط ہوں ان کی کیا ہے انہیں تو خود ٹھیک ٹھاک کر لیں گے، مقاصد تو صحیح ہیں۔ جتنے وہبی علوم بزرگوں کے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ بس ایک سچی بات قلب میں پڑ گئی ان کے منتسبین میں جو اہل علم ہوتے

ہیں وہ یہ کرتے ہیں کہ اس کی تقویت اور تائید دلائل سے بھی کر دیتے ہیں تو ان کے دلائل تابع مقاصد کے ہوتے ہیں بخلاف علمائے رسوم کے ان کے مقاصد تابع دلائل کے ہوتے ہیں۔(۶۴)

مضمون ختم کرتے کرتے حضرت امام نانوتوی کے زمانۂ سلوک کی سرگذشت سے متعلق ایک خاص بات جو اوپر مذکور نہ ہو سکی ہے اس کا ذکر بہت ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ہاں بیعت اور ذکر و شغل کی تعلیم کے بعد قاعدہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگ ان حالات کا تذکرہ کرتے جو ذکر و شغل کے وقت ان کے سامنے پیش آتے تھے مگر خلاف دستور مولانا محمد قاسم نے اپنے کسی حال کا ذکر حاجی صاحب سے نہیں کیا آخر ایک دن خود ہی دریافت فرمایا کہ آپ کچھ نہیں کہتے اپنے پیر کے استفسار پر حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ مولانا (محمد قاسم) رونے لگے، پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے: کہ اپنا حال کیا بیان کروں۔

جہاں تسبیح لے کے بیٹھا، بس ایک مصیبت ہوتی ہے اس قدر گرانی کہ جیسے سو سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے۔ زبان و قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں... اب یہی سننے کی بات ہے... راہ و رسم منزل سے جو آگاہ تھا یعنی آپ کے شیخ عارف بے ساختہ فرمانے لگے کہ "مبارک ہو" مولانا! حق تعالیٰ کے اسم "علیم" کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے اور اسی نسبت خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جا رہا ہے اور جیسا کہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ سے اس موقع پر نقل کیا گیا ہے کہ حاجی صاحب نے مولانا محمد قاسم کو خطاب کر کے فرمایا کہ: "یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا"۔ جس کی تشریح حاجی صاحب کے حوالہ سے انہوں نے یہ کی ہے کہ: تم سے (یعنی مولانا محمد قاسم سے) حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو۔(۶۵)

حضرت امام نانوتوی کے قلب مبارک پر جس فیضان نبوت کی اطلاع حضرت حاجی صاحب نے دی تھی اسی کا یہ اثر تھا جسے سوانح مخطوطہ میں یوں ذکر کیا گیا ہے لکھتے ہیں:

---

(۶۴) مجموعہ ملفوظات حسن العزیز بحوالہ معارف الاکابر ص:۲۶۴۔ (۶۵) سوانح قاسمی ص:۲۵۹

طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آن واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہو گئے جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئے۔(٦٦)

اوپر حضرت امام کی بیعت مرشد کی بحث تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ امام نانوتوی و محدث گنگوہی دونوں ہی حضرات نے طالب علمی ہی کے زمانے میں بیعت کر لی تھی ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت امام نانوتوی کی عمر تقریباً سترہ اٹھارہ ہی سال رہی ہوگی۔

ایسی صورت میں قطب وقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا یہ ارشاد سوانح مخطوط کی مذکورہ بالا شہادت کو مزید مصدق و موثق اور قابل یقین بنا دیتا ہے کہ:

مولانا محمد قاسم کو کم سنی ہی میں ولایت ہو گئی۔

اب قابل توجہ اور لائق غور بات رہ جاتی ہے کہ حضرت امام نانوتوی نے حضرت شیخ حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ سے فیضان نبوت کی مبارک باد سن کر اور ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دینے کی ہدایت پا کر کیا کیا؟ کیا آپ نے ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دیا؟ مجاہدات و ریاضات ترک کر دیئے؟ سوانح میں مذکور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ آپ نے بھی اس فیضان نبوت کے تحت وہی کیا جو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کا اعلان سن لینے کے بعد بھی اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْداً شَكُوْراً فرما کر حق عبودیت ادا کرتے اور محسن حقیقی کی شکر گذاری فرماتے رہے یہی حضرت امام نانوتوی نے بھی کیا رحمہ اللہ و قدس اللہ سرہ۔

حضرت امام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے سلوک و احسان سے متعلق اپنی بساط اور معلومات کی حد تک جو کچھ الٹا سیدھا لکھا جا سکا وہ پیش ناظرین کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے آمین۔

آخر میں ایک حکایت جو اسی موضوع تحریر سے متعلق ہے وہ بھی ملحوظ خاطر رہے تو احقر کے حق میں زیادہ مفید بات ہوگی۔

بزرگوں سے سنا ہے اور بعض کتابوں میں پڑھا بھی ہے لیکن حوالہ مستحضر نہیں ہے اس نقص کے باوجود حکایت قابل سماعت ہے مشہور حکیم و فلسفی شیخ الرئیس بوعلی سینا کے زمانے میں ایک مشہور

(٦٦) سوانح قاسمی ص: ۳۰۲۔

بزرگ صوفی وشاعر حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر بھی تھے بوعلی سینا ایک دن حضرت شیخ کی زیارت و ملاقات کے لئے ان کی مجلس میں حاضر ہوئے کچھ دیر بیٹھے کچھ گفتگو بھی ہوئی ہوگی پھر چلے آئے۔

بعد میں حضرت شیخ کے اہل مجلس میں سے کسی سے پوچھا کہ حضرت شیخ میرے چلے آنے کے بعد کچھ میرے بارے میں فرمایا تو نہیں تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ فرمایا تھا کہ مردے خوب است و لے اخلاق نہ دارد

بوعلی سینا نے یہ سن کر اخلاق پر پورا ایک رسالہ لکھ ڈالا اور حضرت شیخ کی خدمت میں بھیج دیا، شیخ رسالہ کو ادھر ادھر سے دیکھا اور فرمایا من نگفتہ بودم کہ اخلاق نہ داند گفتہ بودم کہ اخلاق نہ دارد

بوعلی سینا نے جو غلطی کی تھی وہی غلطی راقم السطور سے بھی سرزد ہوگئی ہے کہ اخلاق نہ رکھتے ہوئے اخلاق پر یہ مقالہ سپرد قلم کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں صرف راقم السطور کا قصور نہیں ہے اس کی زیادہ تر ذمہ داری سیمنار کے ذمہ داروں کی ہے۔

☆......☆......☆